مینا بازار

(افسانے)

کرشن چندر

کتاب نُما ۔ لاہور

مینا بازار

مینا بازار

(افسانے)

کرشن چندر

کتاب نما
لاہور

کتابت — قصر الکتابت وسن پورہ لاہور

طباعت — عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور

سرورق — موجد

تعداد — ایک ہزار

بار — اوّل

تاریخ اشاعت — اگست ۱۹۶۴ء

قیمت — ۳ روپے ۵۰ پیسے

ناشر

کتاب نما۔ ۱۷۰، انارکلی۔ لاہور

فہرس

مِس لووِٹ

دن پُورا ہو گیا تھا۔ جیسے ہر زندگی کے دن پُورے ہو جاتے ہیں۔ اور اب گہری شام آ چکی تھی۔ اور آسمان پر چھٹے دِن کا چاند خاموش اور جُھکا ہوا تھا۔ اُس بچّے کی طرح جس کے ساتھ کوئی کھیلنے والا نہ ہو۔

شہر کی رات کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ لیکن پہاڑ کی رات کے صرف دو رنگ ہوتے ہیں۔ چاندنی اور تاریکی۔ نشیب میں پھیلنے والی تاریکی اور کناروں پر چمکنے والی چاندنی۔ جنگلوں کو اوڑھ کر سو جانے والی تاریکی اور اُفقی حدوں کو اُجالنے والی چاندنی چھٹے دِن کے چاند کی رات میں چاندنی کم ہوتی ہے۔ رات زیادہ ہوتی ہے۔ کہیں کہیں تاریک شاخوں کی محرابوں پر چاندنی چمکتی ہے۔ کِسی اُونچی چٹان پر دُور جانے والے مسافر کی طرح بیٹھ کر ستانے لگتی ہے۔ کبھی کسی تاریکی میں ڈوبے ہوئے چہرے کے ہونٹوں پر یوں چمکتی ہے۔ جیسے قسمت کے گہرے اندھیرے میں انسان کی کوشش ——

کلب کے نیم چھتے نیم کھلے لاؤنج میں ہر شخص چاندنی اور تاریکی میں ڈوبا ہوا خاموش تھا۔ کیوں کہ خاموشی بھی پہاڑ کی رات کا مزاج ہے۔ لاؤنج کی بتّیاں ڈنر تک کے لئے گل کر دی گئی تھیں۔ تاکہ ہر شخص رات کی خوبصورتی سے لطف لے سکے۔ اور چاندنی اور تاریکی کی شطرنج پر اپنے خیالوں کی بساط کھول دے۔ بتّیاں گُل ہوتے ہی باتیں اور سرگوشیاں مدھم ہو گئی تھیں۔ تاریکی بڑھ آئی تھی۔ اور اس تاریکی میں چاندنی نے جھجکتے جھجکتے انگلیاں بڑھا کر لوگوں اور چیزوں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے کسی کی گردن کی محراب کو چھُوا۔ اور یکایک وہ صُراحی کی گردن سے لانبی ہو گئی اس نے کسی کی آنکھوں کو چھُوا اور آنکھیں کنول کی طرح کھِل گئیں۔ چاندنی کسی کے بالوں میں جا اٹکی اور روشنی کا آنچل بن گئی۔ چاندنی شراب کے جام میں گھل گئی۔ اور تہ در تہ نئے سپنے کھونے لگی۔ اس نے لب لعلیں کو چھُوا اور اُسے یاقوت کر دیا۔ انگوٹھی کے نگینے کو چھُوا اور اُسے ہیرے کی طرح ترش دیا۔ کان کے جھُمکے کو چھوا اور وہاں روشنی کے فانوس روشن ہو گئے۔ چاندنی کہتی ہے جب تک میں ہوں۔ تاریکی کو ثبات نہیں ہے۔

آج چاندنی نے مِس لووِٹ کے دل کو چھُو لیا تھا۔ اور اب وہ سب سے الگ تھلگ صوفے کے ایک کونے میں سمٹی سمٹائی خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کا پُورا جسم اندھیرے میں تھا۔ چاندنی صرف اُس کے سامنے رکھے ہوئے میز پر برانڈی کے گلاس کو چھو رہی تھی۔ اور کلائی تک اس کے ہاتھ کو جس میں سونے کا ایک پتلا سا کنگن اس کے ہاتھ کی جھریوں کو سہلاتا ہوا لرز رہا تھا۔ بڈھی مس لووٹ کی آج چھپّرویں سالگرہ تھی۔ اس لئے ہماری مہربان میزبان جن کی وہ پرانی گورنس تھی۔ آج اُسے

اپنے ساتھ کلب میں لے آئی تھیں۔ مِس لوویٹ کا لباس بہت معمولی تھا۔ پھر بھی اُس کے پاس جو لباس تھے اُن میں بہترین تھا۔ بہت دنوں کے بعد آج اس نے اپنے ہونٹوں پر سُرخی لگائی تھی۔ بالوں کو ایک نئے انداز سے سنوارا تھا۔ حالانکہ اس کے سر پر اُتنے ہی بال تھے جتنے ایک امیر آدمی کے دل میں نئے خیال ہوتے ہیں۔ پھر بھی اس نے اپنے مختصر سے بالوں کی پونجی کو بڑی حفاظت اور احتیاط سے دھویا اور سنوارا تھا۔ اپنے جسم پر خوشبو لگائی تھی۔ عمدہ لباس پہنا تھا۔ اور کلائی میں سونے کا کنگن جو اس کا واحد زیور تھا۔ اور اب سج سنور کر ہماری معزز میزبان کے ہمراہ کلب آگئی تھی۔

گھاٹی سے اُتر کر کلب کی طرف جاتے ہوئے میں نے نئی نظروں سے مِس لوویٹ کی طرف دیکھا اور جن محظوظ نظروں سے پلٹ کر میں نے اور میری بیوی نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔ تو ہم دونوں کی نگاہوں میں ایک ہی سوال آیا۔ بڈھی گھوڑی لال لگام —— ہم لوگ ڈیڑھ ہفتے سے اپنی معزز میزبان کے عالی شان بنگلے میں پڑے ہوئے تھے۔ میری بیوی تو خیر دو ہفتے سے پڑی ہوئی تھی۔ لیکن میں اس دوران میں کمایوں کے مختلف پہاڑوں میں قیمتی دھاتوں کی کانوں کی کھوج میں حکومت کی فرمائش پر گھومتا پھرا اور پھر اپنی تلاش اور کھوج میں مایوس ہو کر نینی تال لوٹ آیا۔ ہم لوگ کل واپس دہلی جانے والے تھے۔ اور آج رات ہمارے اعزاز میں ہماری میزبان نے کلب میں ڈنر دیا تھا اور حسنِ اتفاق سے اِسے مس لوویٹ کی پچھترویں سالگرہ میں ضم کر دیا تھا۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا غالباً اسے ہی کہتے ہیں۔

ان ڈیڑھ ہفتوں ہیں میں نے مس لووٹ سے ہیلو کہنے کے سوا مشکل ہی سے کوئی اور بات چیت کی ہو گی۔ حالانکہ مس لووٹ خالص انگریز گورنس تھیں، جسے مرحوم مہاراجہ نے اپنی بیوی اور ہماری معزز میزبان کی تعلیم و تربیت کے لیئے رکھا تھا۔ وہ انگریزوں کا زمانہ تھا تعلقہ داروں کے عروج اور ٹھاٹ کا زمانہ تھا زندگی کے کتنے ہی حسین تجربے، پُر کیف مسرتیں اور لذتیں مس لووٹ کے حصے میں آئی ہوں گی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اُس عہد کی ایک جھلک دیکھی ہے یا جس کی ایک جھلک آج بھی ہماری میزبان کے محل نما بنگلے میں ملتی ہے۔ اتنی بڈھی ہو جانے کے باوجود مس لووٹ کے چہرے کے خد و خال دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جوانی میں کس بلا کی حسین رہی ہوں گی۔ اور مردوں کے کیسے کیسے جھرمٹوں کی وہ عادی رہی ہوں گی۔ اور اُس عہد کے رنگین مزاج بے فکرے رئیس زادے کس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اُن پر گرے ہوں گے۔ مس لووٹ کے چہرے کو دیکھ کر اُن سب باتوں کا خیال آتا ہے۔ مگر بھیانک کھنڈروں کو دُور ہی سے دیکھنا ٹھیک ہوتا ہے۔ اور ایک بار دیکھ لینے کے بعد دوسری بار دیکھنے اور قریب جانے کی ہمت نہیں ہوتی اس لئے ایک ہی گھر میں اتنا عرصہ قریب رہنے کے باوجود ہیلو سے زیادہ بات نہ ہو سکی ہم لوگ اپنے چھپوں، ہنگاموں اور خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ اور دُور دُور احساس کی حدوں پر کبھی کبھی مس لووٹ کا سایہ منڈلاتا رہا، اور اُن کا زرد زرد جھرّیوں کا سا گہنہ اور بے جان چہرہ کسی پُرانی کتاب کے دیمک خوردہ اوراق کی طرح لرزتا رہا۔ مس لووٹ اپنے کتے کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں۔ مس لووٹ اپنے پرانے کپڑوں کو دھوپ دکھا رہی ہیں۔ مس لووٹ اکیلے

پیشنس کھیل رہی ہیں۔ اکیلے اکیلے ایک مدھم ملول مٹا مٹا سا سایہ ہماری روشن زندگیوں کے ہالے سے باہر جھجک جھجک کر لرزتا رہا اور لرز لرز کر جھجکتا رہا۔ صرف ایک روز میں نے اس سائے کی ہمہ وقت موجودگی سے گھبرا کر اپنی میزبان سے پوچھ لیا۔ اور پوچھتے وقت میری آواز میں اِک ہلکی سی تلخی بھی تھی "آخر جب انگریز چلے گئے۔ تو اِن محترمہ کو یہاں رہنے کی کیا ضرورت تھی؟ ایسا تو نہیں ہے۔ کہ انہیں ہندوستان کی آب و ہوا راس آگئی ہو؟ ہمارے لوگوں کی خصلت، مزاج، عادت، لباس کسی معاملے میں تو مِس لووٹ ہندوستانی نہیں ہیں۔ ان کا لباس انگریزی ہے۔ کُتّے یہ پالتی ہیں۔ انگریزی کھانا یہ کھاتی ہیں۔ سب سے الگ تھلگ یہ رہتی ہیں۔ آخر انہیں ہندوستان میں رہنے کی ایسی کیا ضرورت تھی۔؟"

ہماری میزبان بولیں "گزشتہ تیس برس سے یہ ہمارے پاس ہیں۔ بچپن ہی میں یہ میرے ساتھ لگا دی گئی تھیں۔ کیوں کہ چھٹپن ہی میں میری شادی ہوگئی تھی اور میں تو خود اپنا لباس بھی ٹھیک طرح سے نہیں پہن سکتی تھی۔ انہوں نے ہی مجھے سکھایا پڑھایا۔ اس قابل بنایا جو آج میں ہوں۔ تیس سال ساتھ رہتے رہتے اب یہ میری عادت بن چکی ہیں اور میں ان کی۔ اب نہ یہ مجھے چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ نہ میں انہیں، حالانکہ اب مجھے گورنس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جس تیزی سے حالات بدل رہے ہیں۔ وہ یکایک ——؟ وہ یکایک رُک گئیں اور پھر ہنس کر بولیں۔ "اُن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ خود مجھے کسی دن کسی کی گورنس بننا پڑے گا۔ پھر بھی میں جیسے تیسے ان کے ساتھ نباہ کئے جا رہی ہوں۔"

باتیں کرتے کرتے کلب آگیا۔ اور ہم لوگ اندر چلے گئے۔

مِس لووٹ نے کانپتے ہوئے ہات سے اپنا گلاس اٹھایا اور بقیہ جام ایک ہی گھونٹ میں ختم کردیا۔ اور اس وقت جانے مجھے کیا ہُوا۔ کہ میں نے بیرے سے برانڈی کا ایک پیگ منگوایا اور اپنا گلاس اُٹھا کر اپنے خوش باش دوست مردوں اور عورتوں کے جھرمٹ کو چھوڑ کر دوسرے کونے میں اکیلی بیٹھی ہوئی مس لووٹ کے پاس چلا گیا۔ اور ان کے میز پر برانڈی کا گلاس رکھ کر ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔ "میں آپ کا جامِ صحت پینے آیا ہُوں"

"او تھینک یُوں —— او تھینک یُوں" مِس لووِٹ نے جب لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ اُس سے مجھے اندازہ ہوگیا۔ کہ مس لووٹ رو رہی ہیں۔

میں سناٹے میں آگیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں، کیا نہ کہوں بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور مجھے یُوں محسُوس ہُوا۔ جیسے میں کسی ویران ہال میں آ نکلا ہوں۔ اور آہستہ سے کسی پُرانے دریچے کے پٹ کھول کر گرتی ہوئی بارش میں انگلش مورلینڈ کے کسی بے کیف اور بے رنگ منظر کو دیکھ رہا ہوں۔ حالاں کہ وہ بارش نہ تھی۔ بُڈھے جھُرّیوں والے چہرے پر چپ چاپ بہتے ہوئے کسی کے آنسو تھے۔ ایسے آنسو جن کی آہٹ تک کسی کو محسُوس نہیں ہوتی۔ ایسے آنسو جو بُنا دیکھے آنکھوں سے نکلتے ہیں۔ اور دل کے کسی گوشے میں جذب ہو جاتے ہیں۔

آخر میں نے کہا —— "تُم رو رہی ہو مس لووِٹ!"

وہ کچھ نہیں بولی۔

لاؤنج میں سناٹا تھا۔ جیسے ہم کسی کلب میں نہیں کسی جنگل میں آ نکلے ہوں۔

چاروں طرف خاموشی تھی۔ ہر شخص اپنے اپنے خیالوں میں کھویا تھا۔ صرف کہیں کہیں عورتوں کی مدھم مدھم سرگوشیوں کی آوازیں یوں سنائی دیتی تھیں، جیسے دور کسی جنگل کی تنہائی میں۔ رات کے اندھیرے میں چند ندیاں قریب آکر ایک دوسرے سے باتیں کرتی ہوں۔ اس پس منظر میں مس لوڈرٹ یکایک سسک سِسک کر بولی۔

"مجھے مارکو یاد آرہا ہے۔"

"مارکو کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میرا منگیتر تھا۔"

"فرانسیسی؟"

"نہیں آدھا فرانسیسی آدھا اطالوی۔ اُس کے مردانہ حُسن میں دونوں قوموں کی بہترین صفات اکٹھی ہوگئی تھیں۔ اس کی رنگت اطالویوں کی طرح زیتونی تھی۔ اور ناک اور ہونٹ فرانسیسیوں کے سے اور ماتھا اطالویوں کا سا۔ اور ہنسی فرانسیسیوں کی سی۔ اور ویسی ہی درخشاں تیز گفتاری اور وہی تیز اکدم بھڑک جانے والا غصہ جو اطالویوں میں ہوتا ہے۔ اپنے مارکو سے بہتر مرد میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اس کا سینہ کشتی کے بادبان کی طرح وسیع تھا۔ اور قد مستول کی طرح لانبا اور اس کی آنکھیں ایسی شوخ اور مہربان تھیں جیسے کسی شریر بچے ہی کی ہو سکتی ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے مس لوڈرٹ کی آواز بدل گئی۔ اور اس کا لہجہ خوبصورت یادوں سے جلمگا اُٹھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بارش تھم گئی — دھوپ نکل آئی اور اجنبی ہال کا کونا کونا خوش لباس خوش ادا مرد اور عورتوں کی باتوں

سے گونج گیا ـــــ

وہ ہال بمبئی میں تھا۔ بمبئی کے مضافات میں سمندر کے کنارے اونچی چٹانوں پر ایک دو منزلہ گھر تھا۔ جس کے اوپر کے ہال کے دریچے سمندر کی جانب کھلتے تھے۔ اسی گھر میں مارتھا لووِٹ اپنے ماں باپ کے ہمراہ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میجر لووِٹ آرکیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ میں نوکر تھا۔ اور باندرے میں سمندر کے کنارے ایک عمدہ سجے ہوئے بارہ نوکروں والے گھر میں رہتا تھا۔ اسی گھر کے ہال میں ایک دن مارتھا لووِٹ مارکو کو لے کر آئی تھی۔ اس سے چند دن پہلے مارتھا کی ملاقات مارکو سے آرمی اینوئیل بال ہوئی تھی ـــ ۱۹۱۰ء کا زمانہ تھا۔ ایک اطالوی جہاز یورپی سیاحوں کو لے کر دُنیا کی سیاحت پر نکلا تھا۔ اور گھومتے گھومتے بمبئی کے بندر میں لنگر انداز ہوا تھا۔ آرمی اینوئیل بال کے منیجر نے اس جہاز کے سب یوروپی بھائیوں کو بال میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ مارکو اسی جہاز پر ایک ملّاح تھا۔ اور یہیں اسی بال میں مارکو مارتھا سے ملا۔ اور ملتے ہی دل و جان سے عاشق ہوگیا۔ کیوں کہ مارتھا بے حد حسین تھی۔ اور ہندوستان میں رہ کر کچھ گرم مزاج بھی ہوگئی تھی۔ اس لئے اُسے انگریز عاشقوں کے ٹھنڈے یخ بستہ طور طریقے ناپسند تھے۔ وہ کچھ اس طرح قاعدے اور سلیقے سے محبّت کرتے تھے۔ جیسے محبّت نہ کر رہے ہوں۔ ٹھنڈے پانی میں غسل کر رہے ہوں۔ اس لئے مارتھا اب تک کسی انگریز کی محبّت کو خاطر میں نہ لائی تھی۔ لیکن یہ مارکو بالکل مختلف تھا۔

مارکو کی محبّت میں مارتھا کو ایسے لگا۔ جیسے کسی نے اُسے دونوں بانہوں میں اُٹھایا۔ اور اوپر پھولوں کی شاخوں میں اُچھال دیا۔ یا نیچے سمندر کے پانیوں

میں مچھلی کی طرح تیرنے پر مجبور کر دیا۔ جیسے کسی نے اس کی روح میں ایسی گدگدی کی کہ اُس کا سارا جسم ہنسنے لگا۔ پھر یکایک بجلی کا ایسا کڑکا ہوا۔ کہ وہ ڈر گئی۔ اور آنکھیں مُوند کر اپنے محبوب کی باہوں میں جا چھپی۔ بمبئی میں جہاز صرف چار روز کے لئے رُکا۔ اور وہ چار روز مارتھا کے لئے زمین سے آسمان اور آسمان سے زمین پر آنے والے شب و روز تھے۔ وہ اپنا گھر بھول گئی، اپنے ماں باپ، اپنے بھائی بہن۔ اپنی قومیت، اُس کا مزاج، اس کا رعب، دبدبہ اور شاہی وقار سب بھول گئی۔ ایک عورت بن گئی۔ جو ایک مرد کو چاہتی ہے۔ چوتھے دن مارتھا نے مارکو کو اپنے گھر بلایا۔ اُس کی دعوت کی۔ اُسے اپنے ماں باپ بھائی بہنوں سے سب سے ملایا مارکو سب سے مل کر بے حد خوش ہوا۔ مگر وہ لوگ اس سے مل کر بالکل خوش نہیں ہوئے۔ کیوں کہ مارکو بے حد شگفتہ، حسین خوش مزاج اور خوش گفتار تھا اور انگریزوں کو یہ سب باتیں ناپسند ہیں۔ اس لئے یہ ملاقات اس دعوت کے انگریزی کھانوں کی طرح پھیکی اور بے مزہ رہی۔

"یں دعوت کے بعد مارکو کو سمندر کے کنارے لے آئی۔ باندرے کے کنارے جہاں ہمارا گھر ہے وہاں کا سمندر بالکل ہندوستانی سمندر نہیں لگتا۔ کچھ کچھ ویلز کے ساحل سے ملتا جلتا ہے۔ اُس سمندر کے کنارے اونچی نیچی چٹانوں سے گھرا ہوا گل مُہر کا ایک پیڑ ہے۔ ایسی ہی چاندنی رات تھی۔ ایسی مدھم اور خاموش اور پُر اسرار خوشبوؤں والی۔ اور ایسی ہی رات میں اُس گل مُہر کے پیڑ کے نیچے مارکو نے میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر کہا تھا۔ تم میرا انتظار کرنا۔ میں واپس آؤں گا۔ ایک سال کے بعد۔ اسی دن۔ اسی رات، یہیں پہ، اس گل مُہر کے پیڑ کے

پہنچے، اِسی چاندنی میں تم سے ملُوں گا۔ تم میرا انتظار کرنا اور اپنا کنوارا جسم کسی کو مت دینا۔ کیوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک سال ختم ہونے سے قبل ہی مارتھا کے والد کی ملازمت ختم ہوگئی۔ اور انہیں پنشن ہوگئی۔ اور وہ انگلستان جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر مارتھا کسی طرح ان کے ساتھ انگلستان جانے کو تیار نہ ہوئی۔ اُس کی ماں نے اُسے سمجھایا۔ اُس کے باپ نے، اُس کے بھائی بہنوں نے۔ مگر مارتھا اپنی ضِد پر ڈٹی رہی۔ رخصت کا دن آگیا۔ انگلستان جانے والے جہاز نے لنگر اُٹھا لیا۔ آنسوؤں سے تر بتر رومال ہلاتی ہوئی مارتھا، ہندوستان کے اجنبی ساحل پر اکیلی رہ گئی۔ کیوں کہ اُس نے وعدہ کیا تھا۔ اور اُسے کسی کا انتظار تھا۔ اس دوران میں بہت سے انگریزوں نے اچھے معقول، سنجیدہ، عالی مرتبت انگریزوں نے اُس سے محبّت کی۔ اُس سے شادی کرنا چاہی۔ مگر مارتھا نے سب سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ ایک اطالوی ملاح سے محبت کرتی تھی اس لئے اُس نے آرکیولاجیکل ڈیپارٹمنٹ ہی میں ایک نوکری منظور کر لی۔ اور اُس سونے ویران ہال کے دریچوں کو کھول کر شب و روز سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے اُس اطالوی جہاز کا انتظار کرتی رہی۔ جو دنیا کے گرد چکر کاٹتا ہُوا اُس کے لئے واپس آئے گا۔

اور آخر کار وہ دِن آپہنچا۔ وہ جہاز آن پہنچا اور ایسی ہی چاندنی رات میں مارتھا نے اپنے ہال کے سارے دریچے کھول دیئے اور سر جھکا کر نیچے گُل مہر کے پیڑ کو دیکھنے لگی۔ جہاں ایک اطالوی ملاح کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اور خوشبودں میں بسے ہوتے بال کھولے ہوئے مارتھا مارکو مارکو چلاتی ہوئی ہال کی سیڑھیوں

سے اُتر کر باہر پورچ سے گزر کر نیچے سمندر کی ریت میں اُتر گئی۔ اور دوڑتی دوڑتی گُل مہر کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر مارکو کے سینے سے لگ گئی۔

مارکو نے مارتھا سے کہا: "میں تمہیں کارنو کے جزیرے میں لے چلوں گا۔ جہاں میرا گھر ہے۔ جہاں ہم لوگ مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ جہاں میرے ماں باپ ہیں۔ اور میری سات بہنیں ہیں۔ کارنو کا جزیرہ کاپری کے جزیرے سے بھی خوبصورت ہے۔ اور کارنو کی شراب کا جواب دُنیا میں نہیں ہے۔ اور کارنو سے لذیذ مچھلی دُنیا میں کہیں نہیں ہوتی۔ اور کارنو میں سب نیک دل اطالوی ماہی گیر بستے ہیں۔ کارنو کے پہاڑ کی چوٹی پر مقدس سینٹ اگسٹس کا گرجا ہے۔ اس گرجا میں تمہاری اور میری شادی ہوگی۔

(۳)

مارکو مجھے کارنو میں لے گیا۔ کارنو واقعی ایک حسین اور دلکش جزیرہ ہے۔ اُس کے زمردیں سمندر میں سپید بادبانی کشتیاں دوڑتی ہیں۔ ملاحوں کے گھر سفید رنگ و روغن سے آراستہ ہیں۔ کارنو کی ڈھلوانوں میں انگور کے باغات ہیں اور سنگتروں کے اور زیتون کے اور انجیر کے۔ اور ان کے کنارے بوسوں کی طرح خوبصورت پھول کھلتے ہیں۔ اور کارنو کی سُرخ شراب کا ذائقہ محبّت کی طرح میٹھا ہے اور اس کی طرح ذرا سا تلخ بھی ہے۔ اور کارنو کا چرچ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ اور اس تک پہنچنے کے لئے کارنو کے ماہی گیروں نے گاؤں کے قدموں سے پہاڑ کی چوٹی تک ایک ہزار سیڑھیوں کا زینہ کاٹا ہے۔ اور دُور نیچے سے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا چرچ کے اوپر نصب کردہ صلیب اپنی رفعت میں

آسمان کو، اور وسعت میں زمین کے دونوں کناروں کو چھوتی ہے۔ کارنو والوں کو اپنے گرجا پر بہت ناز ہے۔ اور ایک ہزار سیڑھیوں کا زینہ چڑھ کر ہات میں ہات ملائے ہوئے جب ہم دونوں گرجا کے صحن میں داخل ہوئے تو مقدس مریم کے بت کے سامنے کھڑے ہو کر ہم دونوں نے قسم کھائی۔ کہ جب تک ہم دونوں کی شادی نہ ہو جائے گی۔ ہم اپنا جسم ایک دوسرے کے حوالے نہ کریں گے۔ کیونکہ کارنو کی زمین ہندوستان سے بھی زیادہ گرم مزاج ہے۔ وہاں پھول بوسوں کی طرح کھلتے ہیں۔ اور شراب کا ذائقہ محبت کی طرح میٹھا ہے۔ اور تلخ بھی۔ اس لیئے ہم نے یہ قسم کھائی۔

مارکو نے مجھے اپنے گھر میں رکھا۔ اور مارکو کے ماں باپ نے مجھے بہت پسند کیا۔ اور سارے گاؤں والوں نے میری دعوت کی۔ اور میری خوشی میں ناچے بھی۔ اور مارکو کی ساتوں بہنیں بے حد حسین تھیں۔ اور میری طرح بن بیاہی۔ اور مارکو کا باپ کئی دن تک مجھے اپنی کشتی پر مچھلیاں پکڑنے کے طور طریقے سمجھانے کے لیئے لے جاتا رہا۔ اور راتوں میں مارکو کی ماں مجھے اپنے ساتھ ایسے سلاتی اور اس طرح حفاظت کرتی رہی جیسے وہ میری ساس نہ ہو۔ میری ماں ہو۔

مگر میری شادی کی بات کسی طرح پکی نہ ہوتی تھی۔ گھر والے آپس میں کھسر پھسر کرتے تھے۔ مگر مجھے کچھ نہیں بتاتے تھے۔ آخر ایک دن مجھے مارکو اپنی کشتی میں بٹھا کر بہت دور سمندر میں لے گیا۔ جہاں دور دور تک کوئی بادبانی کشتی نظر نہیں آتی تھی۔ چاروں طرف پانی کی لہریں تھیں۔ اور کارنو کا جزیرہ سمندر کے سینے سے ایک پہاڑ کی طرح بلند ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ ملاحوں کے گھر بھی چھپ گئے تھے۔

صرف چوٹی پر سینٹ آگسٹس کا گرجا نظر آتا تھا۔

یہاں پہنچ کر مارکو نے کشتی کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور میرے سامنے بیٹھ کر مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا

"کیا بات ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "مجھے اتنی دور کیوں لائے ہو؟"

وہ بہت دیر تک چپ رہا۔ اسی طرح عجیب عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ یکایک میں نے گھبرا کر کہا۔ "کیا بات ہے۔ بتاتے کیوں نہیں ہو؟"

وہ پھٹ پڑا۔ "میرے ماں باپ نے پادری سے پوچھا تھا ——— شادی کے لئے ——— میرا مطلب ہے۔ ہماری تمہاری شادی کے لئے ———"

"پھر؟"

"پادری نے انکار کر دیا۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ تم رومن کیتھولک نہیں ہو۔"

"پھر؟" میں نے ذرا غصّے میں آکر پوچھا۔

مارکو نے سر جھکا لیا۔ آہستہ سے بولا۔ "پھر میں کیا کہوں؟ میرے ماں باپ نے مجھ سے کہا ہے۔ کہ اگر تم رومن کیتھولک ہو جاؤ۔ تو یہ شادی ہو سکتی ہے۔"

"میں رومن کیتھولک کیوں ہو جاؤں۔ تم پروٹسٹنٹ کیوں نہ ہو جاؤ ———؟"

یکایک میں نے انتہائی تلخ لہجے میں اُس سے پوچھا۔

مارکو نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ "کیسے ہ ——— کیسے ———؟ میں اپنے ماں باپ کا مذہب چھوڑ سکتا ہوں ——؟"

"تو میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟"

"تمہیں چھوڑنا پڑے گا۔ میری خاطر۔" مارکو نے گرج کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ یکایک وہ بپھر گیا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا۔ اور آنکھوں کی پتلیاں تاروں کی طرح ناچنے لگی تھیں۔

"یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔" میں نے مٹھیاں بھینچ کر اس سے کہا۔

"بکومت۔"

"تم بکومت۔" میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

غصّے سے میرے جسم کا رُواں رُواں لرز رہا تھا۔ اور میں رونے کے قریب تھی۔ اس وقت اگر مارکو مجھے اپنے گلے سے لگا لیتا تو میں اُس کے سینے سے لگ جاتی، اور بلک بلک کر اپنا غصّہ دھو ڈالتی، اور اس کے لئے رومن کیتھولک تو کیا، یہودی یا مسلمان بھی ہوجاتی۔ جو مذہب بھی وہ مجھے اختیار کرنے کو کہتا کر لیتی۔ مگر وہ دونوں بازو اپنے سینے کے گرد بھینچے شعلے کی طرح سُرخ ہوتا رہا اور جلتا ہوا۔ مجھے دیکھتا رہا۔ پھر غصّے سے بولا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں آخری فیصلہ ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور انتہائی غصّے میں نکلا۔ دوسرے لمحے میں میرا جی چاہا۔ کہ وہ میری زبان گُدّی سے پکڑ کر باہر نکال لے۔ مجھے کشتی میں گرا کر زور زور سے مُکّے مارے یا مجھے اپنی باہوں میں اُٹھا کر سمندر میں پھینک دے۔

مگر کچھ بھی تو نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اور وہ لمحہ گزر

گیا۔ پھر اُس نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ اور کشتی چلانے لگا۔ کارنو کی طرف نہیں۔ بلکہ کارنو کی مخالف سمت کو ساحل کی جانب۔ جہاں سے ایک گاڑی نیپلز کو جاتی ہے۔

ساحل پر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا۔ "میں تمہارے لئے یہاں سے نیپلز اور نیپلز سے پیرس تک کا ٹکٹ کٹا دیتا ہوں۔ اور آگے جانے کے لئے اُتنے پیسے دیتا ہوں۔ تاکہ تم آرام سے انگلستان پہنچ سکو۔"

"میں انگلستان نہیں جاؤں گی۔"

مارکو نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تو پھر تم کہاں جاؤ گی؟"

"بمبئی۔"

"بمبئی؟" مارکو نے اور زیادہ حیرت سے میری طرف دیکھا۔ بمبئی میں تمہارا کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے، اسی لئے تو وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

جب میں واپس بمبئی آئی۔ تو مجھے اپنے پرانے پتے پر مارکو کا خط ملا۔ وہ شدید پچھتاوے اور گہری محبت کا خط تھا۔ اور اس خط میں مارکو نے فیصلہ کیا تھا کہ جونہی رومن کیتھولک رسم ورواج کے مطابق اس کی ساتوں بہنوں کی شادی ہو جائے گی۔ جس میں سب سے چھوٹی کی عمر دس سال کی تھی۔ تو وہ کارنو جزیرے کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔ اور ایک بار پھر بمبئی کا چکر لگائے گا۔ اور گو اُسے کوئی اُمید تو نہیں ہے۔ لیکن مارکو ایک بار بمبئی ضرور آئے گا۔ اور سمندر کے کنارے گل مہر کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو کر اپنی محبوبہ کو ضرور آواز دے گا۔

میں نے اس کے خط کا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن ہر سال کرسمس کے

موقعے پر اُسے ایک کارڈ ضرور بھیجتی رہی جس میں کچھ لکھا نہ ہوتا تھا۔ صرف میرے دستخط ہوتے تھے۔ "مس مارتھا لووِٹ"۔ جواب میں ہر سال مجھے بھی اُس کا ایک کرسمس کارڈ مِلتا تھا جس پر صرف اتنا لکھا ہوتا تھا "تمہارا عاشق۔ مارکو"

پھر میں نے بمبئی آکر ملازمت اختیار کر لی۔ اور اُس ویران ہال کے دریچے کھولے۔ اور مارکو کا انتظار کرنے لگی۔ پہلے سال میں نے سوچا۔ اب اس کی سب سے بڑی بہن کی شادی ہو گئی ہو گی۔ دوسرے سال میں نے سوچا۔ اب اُس کی دوسری بہن کی شادی ہو گئی ہو گی۔ تیسرے سال میں نے سوچا۔ اب اس کی تیسری بہن کی شادی ہو گئی ہو گی۔ اگلے پانچ سالوں میں میں نے اس کی پانچ بہنوں کی شادی کر ڈالی۔ پھر چھٹی کی شادی کے لئے تین سال انتظار کیا۔ کیوں کہ وہ سب سے چھوٹی تھی۔ اس دوران میں پلیگ کی وبا پھیلی۔ اور میں نے سوچا۔ مارکو کی بہنیں اس وبا میں مر گئی ہونگی۔ پھر سارے یوروپ میں انفلوئنزا پھیلا اور میں نے سوچا۔ کہ اب تو مارکو کی غیر شادی شدہ بہنوں کا بچنا مشکل ہے۔ مگر مارکو کے خط آتے رہے۔ بارہ سال میں بارہ خط آئے۔ اُمید کے بارہ نغمے۔ پھر خط آنے بند ہو گئے۔ مگر میں ہر سال کرسمس کے روز مارکو کو خط ڈالتی رہی۔ بیس سال تک میں نے بمبئی میں مارکو کا انتظار کیا۔ پھر میں بمبئی سے لکھنؤ چلی آئی۔ مرحوم مہاراجہ نے تمہاری میزبان کے لئے مجھے گورنس رکھ لیا۔ پھر مہاراجہ مر گئے۔ پھر تمہارا ملک آزاد ہو گیا۔ ایک جُگ بیت گیا۔ زمانہ بدل گیا۔ مگر مارکو نہیں آیا۔"

"اور تم نے شادی نہیں کی؟"

"نہیں۔"

"ممکن ہے مارکو مرچکا ہو۔" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"ایسا مت کہو۔" مس لووٹ نے ناگن کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ اور مجھے اُس کے ناخن اپنی کلائی میں گڑتے ہوئے محسوس ہُوئے۔

"ہو نہیں سکتا۔ ہو نہیں سکتا۔ ابھی تک میرا مارکو میری طرح کنوارا ہے۔"

"ممکن ہے اس نے سوچا ہو۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔" میں نے پھر کہا۔

"محبت کے لئے کبھی دیر نہیں ہوتی۔"

"مارکو اب بڈھا ہو چکا ہوگا۔ اس کے بیٹے ہوں گے۔ پوتے اور پڑپوتے اور وہ اپنے خوب صُورت جزیرے میں اپنے خاندان والوں میں گھرا ہوا کھانا کھا رہا ہوگا۔"

"میرا مارکو کبھی بُڈھا نہیں ہو سکتا۔" مارتھا لووِٹ نے شدید تیزی اور تُندی سے کہا۔ "وہ اُسی طرح خوبصورت اور جوان اور ہنس مکھ ہے۔ جس طرح میں نے اُسے پہلے روز دیکھا تھا۔"

پھر یکایک مِس لووِٹ کی آواز تھرا گئی۔ اور اُس نے میری کلائی چھوڑ دی اور گلوگیر لہجے میں سِسکتے ہُوئے، ہوا کی سرگوشی سے بھی آہستہ لہجے میں بُولی۔

ابھی اس وقت جب تم آئے اور آکے میرے قریب صوفے پر بیٹھ گئے۔ مجھے یہ لگ رہا تھا اور اب بھی یہ لگتا ہے۔ جیسے یہ سامنے کی جھیل نینی تال کی جھیل نہیں ہے۔ کارنو کا چھوٹا سا سمندر ہے۔ یہ سامنے جو پہاڑ ہے اور تاریک درختوں سے ڈھکا ہے۔ کارنو کے جزیرے کا پہاڑ ہے۔ اور یہ سامنے جو روشنیاں ہیں۔ کارنو کے ماہی گیروں کے گھر ہیں۔ اور وہ دُور جو ایک بادبانی کشتی اپنے سفید بادبان

پھیلائے چاندنی میں ڈول رہی ہے۔ مارکو کی کشتی ہے۔ جسے کھیتا ہُوا۔ گیت گاتا ہُوا مارکو ادھر لے کے آئے گا۔ اور پانی میں ڈوبتے ہوئے چوبی ستونوں سے باندھ کر کلب کے اندر آ جائے گا۔ اور سب کے سامنے مجھے اپنی گود میں اُٹھائے گا۔ اور مجھے اِس ساحل سے اُس ساحل لے جائے گا۔ جہاں میرا گھر ہے۔"

یکایک مارتھا کی آواز ڈوب گئی۔ اور میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور میں نے اُس کے طلائی کنگن والے لرزتے ہوئے ہات کو بوسہ دیا اور کہا۔ "مِس مارتھا لووِٹ! سیتا صرف ہمارے مُلک کی میراث نہیں ہے۔ سیتا تو ہر مُلک میں ہوتی ہے۔"

پھر یکایک کلب کے لاونج میں روشنیاں ہو گئیں کیوں کہ ڈِنر کا ٹائم ہو گیا تھا۔ اور میں صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مؤدبانہ انداز میں مِس لووِٹ کے سامنے جُھکا اور اس کا ہات تھام کر اُسے کھانے کے کمرے کی طرف یوں لے چلا۔ جیسے میری بغل میں کوئی پچھتر سالہ بُڈھی نہیں ہے۔ خوابوں کے جزیرے کی ایک حسین شہزادی ہے۔

لکڑی کے کھوکھے

سارا جھگڑا مس کنول نے شروع کیا۔ جب وہ پہلے دن تال کلب کے دروازے میں داخل ہوئی تو اُسے دیکھتے ہی کلب کے ممبروں کی سانس ایک لمحے کے لئے رُک گئی۔ رخسار گلابی، ہونٹ شہابی، آنکھیں شرابی، چال جیسے جھیل کی لہر، تبسم جیسے تابناک سحر، سینہ طوفانی، کمر ہیجانی، اس پہ باتیں ایسی میٹھی جیسے چھتّے سے شہد ٹپکتا ہو۔ اُسے دیکھتے ہی سنگھ بیر اور ہیر انند ساہ لٹو ہو گئے۔ اور سائے کی طرح اس کے آگے پیچھے رہنے لگے۔

سنگھ بیر چھ فٹ کا لانبا باوقار مرد تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور جبڑے مضبوط تھے۔ اس کے دانت بے حد سپید اور ہونٹوں کے اندر موتی کی لڑیوں کی طرح پروئے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کا ماتھا چوڑا اور ہنسی کھلی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسے آدمی کی ہنسی تھی جو کھلے آسمانوں کے نیچے سونے کا عادی ہو، وہ ایک عمدہ

تیراک، ایک مشاق شکاری، اور مغرور انسان تھا۔ مغرور وہ کیوں نہ ہوتا۔ آج سے بیس سال پہلے جب وہ اپنے ماں باپ سے جھگڑ کر تلاش روزگار کے سلسلے میں کماؤں کی وادی میں داخل ہوا تو اُس کی جیب میں صرف پندرہ روپے تھے اور آج بیس سال بعد اس کا شمار کماؤں کے معزز ترین ٹھیکے داروں میں ہوتا تھا۔ کاٹھ گودام میں اس کا گودام سب سے بڑا اور وسیع تھا۔ اور ڈیڑھ میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کی کوٹھیاں نینی تال، کاٹھ گودام، ہلدوانی، دلی اور ڈیرہ دون تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے جنگلات کے ٹھیکے کماؤں، نیپال، ڈیرہ دون سے لے کر کشمیر تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن ہیرا نند ساہ، شکھ بیر کو نو دولتا ہی سمجھتا تھا کیونکہ ہیرا نند ساہ خاندانی ٹھیکے دار تھا۔ وہ کماؤں ہی کا رہنے والا تھا۔ اور جدّی اور پشتینی رئیس تھا۔ نینی تال کی آدھی بلڈنگیں اس کی تھیں۔ اور رانی کھیت کا سب سے بڑا فارم اس کا تھا۔ اور جُولی کوٹ کا سب سے بڑا شہد فارم اس کا تھا۔ گندے بیروزے کا کارخانہ اور ایک بریوری کا بھی وہ مالک تھا۔ نینی تال کی ہر کلب میں اس کی بیئر سپلائی ہوتی تھی۔ چالیس سال کی حدود پار کرنے کے باوجود وہ حیرت انگیز طور پر جوان اور خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ عورتوں کے سے، جلد بے حد نازک اور صبیح، گفتار میں تمکنت اور تہذیب تھی۔ وہ بے حد سلیقے اور رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا۔ اس کی پانچ بیویاں تھیں اور بہت سے بچے۔ اور موٹر گاڑیاں اور وہ ہر سال ایک نئی لڑکی کو ولایت لے جاتا تھا۔ اُسے موسیقی، کتابوں اور عمدہ قسم کی شرابوں سے بڑی دلچسپی تھی دیکھنے میں وہ نرم رو، نرم دل اور تن آسان معلوم ہوتا تھا۔ مگر درحقیقت ایسا نہ تھا۔ اگر اُسے کسی بات کی ضد ہو جاتی تو وہ اُسے حاصل کر کے رہتا تھا۔ چاہے وہ عورت ہو

یا جنگل کا ٹھیکہ! اُس کی یہ ضد بھی پشتینی تھی اور بزرگوں سے ورثے میں آئی تھی۔

مس کنول کہاں سے آئی تھی اور کدھر جائے گی! اس کا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا مگر میلے کے سیزن میں دُور دُور کے میدانوں سے نینی تال میں سینکڑوں تتلیاں آتی ہیں۔ اور پھول پھول اُڑ کر شہد کے ذرے چکھتی ہیں۔ اور پھر سیزن ختم ہوتے ہی اپنے رنگین خوشنما پروں کو جھلاتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں۔ کہاں؟ کدھر؟ کون جانے اور کون یاد رکھے؟ نازک نازک بجرے جھیل کی سطح پر ڈولتے رہتے ہیں۔ اور جھیل کے کنارے کلب کے چھتے ہوئے اور کھلے برآمدوں میں ممبر بیئر پیتے رہتے ہیں اور عورتیں اپنے پرس سے ننھے آئینے نکال کر اپنے ہونٹوں پر لپ سٹک ٹھیک کرتی رہتی ہیں اور کلب کے دروازے کے باہر ڈونڈی بردار اپنے پھٹے کپڑوں کی جوئیں چنتے رہتے ہیں۔ اب اس سے کوئی کیا جانے، اور کیا یاد رکھے، اور کیا سمجھے؟ سمجھنا حماقت ہے۔ یہ دو چار لمحے جو رنگین تتلیوں کی طرح خوب صورت اور پُر افشاں، اسی جھیل کے کنارے نظر آتے ہیں۔ بس یہی غنیمت ہیں — اور ان سب میں سے اس وقت مس کنول غنیمت ہے۔ کیونکہ وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اور اس کی ماں بوڑھی ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ بھوپال سے یا حیدر آباد سے یا بمبئی سے یا کہاں سے آئی ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ میدان خالی ہے اور ذمے داری صفر ہے۔

اِس لئے دونوں اُستاد پل پڑے۔

سب سے پہلے ہیرا نند ساہ نے مس کنول کے اعزاز میں ایک پارٹی دی۔ اس میں سبھی آئے تھے۔ کنورانی دیویدیال اور ٹکارانی پربھودیال۔ رائے بہادر ڈمی ڈی ہون اور خان بہادر افلاطون، کنور سعادت علی اور رانا بخت بہادر، راجہ صاحب

تیمار پور جو شکل و صورت سے بیمار پور کے راجہ معلوم ہوتے تھے۔ اور رانی صاحبہ باز پور جنہیں دیکھ کر کسی باز کے بجائے کسی جہاز کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ سبھی آئے تھے۔ عورتیں پانی کی طرح شمپین پیتی تھیں۔ اور مرد شمپین کی طرح وہسکی پیتے تھے۔ اور مس کنول تین بار ہیرانند ساہ کے ساتھ ناچی تھی۔ اور ہیرانند ساہ نے کومل بینڈ کو نظر انداز کر کے دِلّی سے ڈوگی ووگی بینڈ منگوایا تھا۔ غرضیکہ پارٹی بڑی ٹھٹے کی رہی۔ سبھی آئے تھے۔ سوائے سُکھ بیر کے۔ کیونکہ ہیرانند ساہ نے سُکھ بیر کو دعوت میں بلایا ہی نہیں تھا۔

اِس پر سُکھ بیر نے جل کر دو دن بعد مس کنول کی سالگرہ منا ڈالی۔ حالانکہ ابھی اُس یوم سعید میں دو ماہ باقی تھے۔ مگر سُکھ بیر نے کسی نہ کسی طرح مس کنول کو اپنی سالگرہ دو ماہ پہلے منانے پر راضی کر لیا۔

"دو ماہ بعد دوسری سالگرہ منا ڈالیں گے!" سُکھ بیر نے مشورہ دیا۔

"سال میں دو مرتبہ سالگرہ؟" مس کنول نے اپنی بھنوؤں کی کمان کھینچ کر کہا۔ "واہ ایسے تو میں بہت جلد بوڑھی ہو جاؤں گی! مسٹر بیر!!"

مگر جب مس کنول کو سُکھ بیر نے ہیرے کا ایک جڑاؤ گلوبند تحفے میں دیا۔ تو وہ اپنی سالگرہ قبل از وقت منانے پر راضی ہو گئی۔ اور کوئی خوب صورت عورت اس سے بڑی مہربانی نہیں کر سکتی۔ کہ اپنی سالگرہ وقت سے پہلے منانے پر تیار ہو جائے!

پارٹی بڑی شاندار تھی۔ راجہ صاحب لاگرا اور نواب آف گھاگھرا، بیگم دلودی اور رانی صاحبہ گاؤدی۔ کرنل گھوڑے والا اور مسز چھتری والا، پیر صاحب رو ڈا اور مہنت صاحب ٹوڈا سبھی موجود تھے۔ نینی تال کی کوئی صاحب تقدیر ہستی ایسی نہ تھی۔

جو اس پارٹی میں موجود نہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ خود چیف کمشنر صاحب بہادر بہ نفس نفیس اس پارٹی میں موجود تھے۔ اور اُن کا بیٹا رزاق بھی۔ جو نیا نیا آئی اے ایس کی سروس میں آیا تھا۔ اور یہ دونوں حاکم ہیرا نند ساہ کی پارٹی میں موجود نہ تھے۔ اس لئے سُکھ بیر کی پارٹی ہیرا نند ساہ کی پارٹی سے بہتر قرار دی گئی۔ آج سکھ بیر بے حد خوش تھا۔ کنول سے پہلا ڈانس چیف کمشنر صاحب کو دیا۔ دوسرا اُن کے بیٹے رزاق کو۔ اس کے بعد وہ چار بار سُکھ بیر کے ساتھ ناچی۔ اور صرف سکھ بیر کے ساتھ۔ اور ہیرا نند ساہ کا کہیں دُور دُور پتہ نہ تھا۔ کیونکہ سُکھ بیر نے اُسے اپنی دعوت میں مدعو نہ کیا تھا۔

"یہ کلچر ولچر سب بکواس ہے!" سُکھ بیر نے مس کنول کو سمجھایا۔ اصل چیز شکار ہے۔ جو مزا شکار میں ہے وہ کلچر میں کہاں۔ آپ نے کبھی شیر کا شکار کیا ہے کنول جی؟ میں آپ کو شیر کے شکار پہ لے چلوں گا۔ ہاتھی پر! گھبرایئے نہیں، آپ بالکل محفوظ رہیں گی۔"

کنول نے ایک شیر مارا۔ گولی تو سُکھ بیر نے ہی چلائی تھی۔ مگر صرف ایک گولی شیر کے لگی، اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ گولی کنول کی تھی۔ سُکھ بیر نے اُسے یقین دلایا۔ اور کنول شیر کی لاش پر اپنا پاؤں رکھ کر تصویر کھینچوا کر بہت خوش ہوئی۔ یہ تصویر اگلے ہفتے کے سرورق پر "دُو منز ویکلی" میں چھپ گئی۔ اور مس کنول وہ پہلی عورت قرار پائی جس نے پچھلے دو سو برس میں شیر کا شکار کیا تھا۔

پھر ہیرا نند ساہ مس کنول اور اس کی ماں اور دو نوکروں اور دو چھوٹے چھوٹے بھتیجوں کو لے کر بھیم تال اور نکچویا تال گھما لایا۔

دو دن بعد سُکھ بیر نے اسی پارٹی کو رانی کھیت کی سیر کرادی۔ مس کنول بڑی بھولی حسینہ تھی۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ در پردہ کسی کے دل میں کیا ہے۔ جس معصومیت سے وہ سُکھ بیر کی پارٹی میں شامل ہوتی تھی، اُسی دلچسپی سے وہ ہیرانند ساہ کی پارٹی میں آتی تھی۔ جس شکریے سے وہ سُکھ بیر کا تحفہ منظور کرتی تھی اُسی اطمینان سے وہ ہیرانند کے ساتھ گھومنے جاتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا بے داغ اُجلا پن تھا۔ جسے دیکھ کر سُکھ بیر اور ہیرانند ساہ ایسے عاصیوں کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کہ اُسے کچھ کہہ سکیں!۔ اور ایک بار سکھ بیر اور ساہ نے اشاروں ہی اشاروں میں حرفِ مدعا بیان کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر بھولی کنول نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ یوں صاف سیدھی کھڑی نگاہ سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ حیرت سے، جیسے اُس کے پلّے کچھ نہ پڑا ہو۔

پھر ایک روز کنول نے ہیرانند ساہ سے کہا۔ "سُکھ بیر کہتا تھا۔ کہ ہیرانند ساہ اپنی بیویوں کو پیٹتا ہے۔ اُوپر سے مہذب بنتا ہے۔ مگر اندر سے بالکل جاہل اور پہاڑیا ہے!"

ہیرانند ساہ غصّے سے لال ہو گیا: "وہ مجھے پہاڑیا کہتا ہے۔ غیر مہذب اور جاہل، وہ —— وہ پنجابڑا مجھے پہاڑیا کہتا ہے؟ جسے خود تمیز چھو تک نہیں گئی ہے؟ جو خود مڈل فیل ہے۔ وہ مجھے جاہل کہتا ہے؟ —" ہیرانند ساہ نے نفرت اور بے زاری سے مُنہ پھیر لیا۔ پھر اپنے آپ پر قابو پا کر بولا —— "کنول جی، آپ کی جان کی قسم جو آج تک میں نے کسی عورت پر ہاتھ اُٹھایا ہو۔"

کنول کی گھنیری پلکیں اُس کے رخساروں پر تھر تھرائیں اور اُس نے ہولے سے کہا ——

"تمہیں اس کا یقین ہے!"

اس کے چند روز بعد کنول سکھ بیر کے ساتھ اُس کے ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ سکھ بیر اب تک وہسکی کے پانچ پیگ پی چکا تھا اور کھلے تعریفی انداز میں جمیلہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا جا رہا تھا۔

یکایک کنول اپنی کرسی پر کسمسائی

"ایک بات کہوں!" وہ بولی

"کہو"

"کسی سے کہو گے تو نہیں!"

"نہیں!" سکھ بیر کا دل غیر متوقع خوشی سے دھڑکنے لگا۔

"پہلے وعدہ کرو" وہ بڑی کمزور اور میٹھی آواز میں بولی اور بولتے بولتے شرما گئی۔

سکھ بیر آگے جھکا جذبات کی پوری شدت سے بولا

"تمہاری جان کی قسم!"

"ہائے ہائے!" کنول گھبرا کر بولی۔ "میری جان کی قسم کیوں کھاتے ہو۔!"

"اس لئے کہ تمہاری جان سے زیادہ اس دنیا میں مجھے کوئی عزیز نہیں!" سکھ بیر نے جذبات سے گلوگیر لہجے میں کہا۔

کنول رازدارانہ لہجے میں بولی: "وہ ہیرانند ساہ تمہاری بُرائی کرتا تھا۔ مجھ سے کہتا تھا۔ اُس کے ٹیبل پر مت بیٹھا کرو۔ سکھ بیر سے باتیں مت کیا کرو وہ اُسے آتا ہی کیا ہے۔ اور اس کی شخصیت ہی کیا ہے! جاہل لٹھ گنوار بدتمیز اور

مڈل فیل ہے۔ اور نرا نودولتا ہے۔ اور دولت بھی اس کے پاس کیا ہوگی۔ یہی کوئی دس پندرہ لاکھ روپے۔"

"کیا کہا؟" سکھ بیر اکدم بھڑک کر بولا۔" میں جاہل اور مڈل فیل ہوں؟"

"آہستہ بولو۔ وہ سن لے گا!" کنول نے گھبرا کر دوسرے کونے میں بیٹھے ہوئے ہیرا نند ساہ کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں سے اشارہ کیا۔

"سن لے۔" سکھ بیر گرج کر بولا۔" وہ کیا اس کا باپ بھی سن لے! اچھا تو میں نودولتا ہوں؟ میرے پاس صرف دس پندرہ لاکھ روپے ہیں؟ سالا، پہاڑیا، کتا، کمینہ!" سکھ بیر اپنی ٹیبل سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

کنول اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔"مگر تم نے وعدہ کیا تھا کہ کسی سے نہیں کہو گے!"

سکھ بیر نے زور سے کنول کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور میز پر پڑا ہوا اپنا جام خالی کر دیا۔ پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا۔ ہیرا نند ساہ کے سر پر جا کھڑا ہوا اور غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ابے ساہ! تم نے مجھے نودولتا سمجھا ہے؟ —— ایں؟ میرے پاس صرف دس پندرہ لاکھ روپے ہیں؟ —— ایں؟ —— اور تم بہت بڑے سیٹھ ہو؟ کروڑوں کے مالک! کماؤں کے رئیس اعظم؟ دیکھتا ہوں۔ کون کماؤں کا رئیس اعظم ہے؟ میں یا تم؟ اگر اپنے باپ کے بیٹے ہو۔ تو ابھی اُٹھ کر میرے ساتھ جھیل پر چلو۔ اور گھر سے پیسے منگاؤ۔ ایک سو کا نوٹ میں پانی میں ڈالتا ہوں۔ ایک سو کا تم ڈالو۔ دیکھتا ہوں کس کے پاس دولت زیادہ ہے؟ میرے پاس یا تمہارے پاس؟ اور میں کیا دیکھوں گا۔ سارا کلب دیکھے گا۔ سارا نینی تال دیکھے گا۔"

"چھوڑو چھوڑو جانے دو"۔ رانی بازپود نے سُکھ بیر کا دامن پکڑ کر اُسے بٹھانا چاہا ——!

"اپنے باپ کی اولاد ہو تو ابھی میری شرط منظور کرو!" سُکھ بیر اُسی غضبناک لہجے میں چیخ کر بولا۔ "نہیں تو —— تُف ہے تم پر اور تمہاری سات پشتوں پر!"

بجلی کی سی تیزی سے ہیرانند ساہ کھڑا ہوگیا، اُس کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہوگیا۔ اور وہ چلّا کر بولا۔ "مجھے منظور ہے۔ ابھی منظور ہے۔ چلو جھیل کے کنارے! —— سالا۔ باہر سے آٹھ آنے لے کر آیا تھا آج کماؤں کا رئیس بنا پھرتا ہے۔ دیکھ لیں گے۔ آج تیری رئیسی بھی!"

کلب کے بہت سے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرانا چاہا، مگر دونوں نشے میں چور اپنی دولت میں سرشار کرسیاں گھسیٹ کر کھلے برآمدے میں چلے گئے۔ جو جھیل کے اوپر واقع تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے آہنی جنگلے کے قریب بیٹھ گئے۔

نیچے جھیل کا پانی تھا۔ پانی کے کنارے چوبی بجروں پر بیٹھے ہوئے شکستہ حال ملاح بیچ بیچ کر سیاحوں کو نینی جھیل کی سیر کے لئے بلا رہے تھے —— "ایک روپیہ میں تلّی تال لے جاؤں گا سیٹھ!"

"ڈیڑھ روپے میں ملّی تال سے تلّی تال اور تلّی تال سے ملّی تال راجہ صاحب —— رانی صاحب —— سیٹھ جی —— سردار جی —— صرف ڈیڑھ روپے ہیں!"

سُکھ بیر نے سو کا ایک نوٹ اپنی جیب سے نکالا اور نیچے پانی میں گرا دیا۔ ہیرانند ساہ نے اپنے بھاری بٹوے کو کھولا اور سو کا ایک نوٹ بڑی نخوت سے نیچے پھینک دیا۔

(۲)

ایک گھنٹے کے بعد بھی وہ دونوں باری باری پانی میں نوٹ پھینک رہے تھے۔ کنول تو رنذاق کے ساتھ ڈانس فلور پر ناچنے کے لئے چلی گئی تھی۔ جھیل کے پانیوں میں سینکڑوں ملاح، ڈانڈی والے، مزدور، متوسط طبقے کے وہ سب لوگ جنہیں تیرنا آتا تھا، ایک جم غفیر کی صورت میں اکٹھا تھے۔ اور پانی میں گرنے سے پہلے نوٹوں کو دبوچنے کے لئے مشتاق نظر آتے تھے۔ نینی تال کی پوری تاریخ میں ایسا واقعہ کبھی نہ پیش آیا تھا۔ نیچے پانیوں میں لوگ جیسے پاگل ہو گئے ہوں۔ چیخ دھاڑ، ہائے واویلا۔ کسی کے ہاتھ میں نوٹ آجاتا تو وہ وہیں ڈبکی لگا جاتا۔ دوسرا اُسے چھیننے کے لئے بھاگتا۔ نوٹ ایک دوسرے سے ایسے چھینے جاتے جیسے کٹی ہوئی پتنگ پر لڑکے گرتے ہیں۔ ایک لمحے میں نوٹ کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔

مگر پانیوں سے اوپر اُٹھے ہوئے برآمدے میں جنگلے کے کنارے وہ دونوں رئیس باری باری سے انتہائی اطمینان سے نوٹ ڈالتے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے گھروں سے نوٹوں کے صندوق منگائے تھے۔ لکڑی کے صندوق میں بھرے ہوئے جنگ کے زمانے کے پرانے نوٹ، بلیک کی بے تحاشا کمائی جسے وائٹ کرنے کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئی تھیں لاکھوں آدمیوں کی منجمد محنت ایک ایک نوٹ کی صورت میں پانی میں بہائی جا رہی تھی۔

دو گھنٹے کے بعد وہ لوگ تھک سے گئے۔ ہر چند لمحوں کے بعد صندوق سے ایک نوٹ نکالو۔ ہاتھ اُٹھا کر اُسے جنگلے سے باہر لے جاؤ۔ پھر اُسے پانی میں گرا دو۔ پھر ہاتھ پیچھے کھینچو۔ پھر صندوق کے اندر لے جاؤ۔ پھر ایک نوٹ نکالو۔ بڑی محنت

کا کام ہے صاحب! دو گھنٹے میں وہ دونوں تھک گئے۔

ہیرا انند ساہ نے کہا: "ایک ایک پیگ وہسکی کا نہ پی لیں؟"

"کیا حرج ہے!" شکھ بیر بولا۔ اب اُس کی وہسکی بھی اُترنے لگی تھی۔

دونوں نے ہاتھ روک لئے اور وہسکی کے لئے آرڈر دیا۔ مگر وہاں کلب میں ملازم کہاں تھے۔ سب لوگ نیچے پانیوں میں تھے۔ ناچار شکھ بیر خود بار کے اندر جا کے وہسکی کی بوتل لایا۔ ساہ سوڈے کی بوتلیں اُٹھائے اس کے ساتھ واپس جنگلے پر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گلاس میں وہسکی انڈیل کر اور سوڈا ڈال کر پینا شروع کی۔

"ہیئر از بیسٹ!" شکھ بیر بولا۔

"بیسٹ آف لک!" ساہ بولا۔

دونوں نے اپنے جام ٹکرلئے اور وہسکی پینے لگے۔ ہولے ہولے اور ہیرا انند ساہ نے اپنے صندوق کی طرف دیکھ کر کہا: "سالی جنگ کے دنوں میں کیا کمائی ہوئی تھی؟"

"کوئی اندازہ ہی نہیں تھا!" سکھ بیر نے پرانے اچھے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا: "پہلے روز میں ایک ہزار کی آمدنی ہوئی تھی۔ پھر دو ہزار کی ہونے لگی۔ پھر تین ہزار کی۔ جوں جوں جنگ بڑھتی گئی۔ میری آمدنی بھی بڑھتی گئی۔ جب میری آمدنی روز کی دس ہزار ہونے لگی۔ تو میں نے گننا بند کر دیا۔ نوٹوں کو لکڑی کے کھوکھوں میں ڈال کر گھر میں رکھتا گیا۔ کوئی کہاں تک گنے!"

"تم دُرست کہتے ہو!" ہیرا انند ساہ نے اقرار کیا۔ "وہ دن کیا اچھے تھے۔ ولیکن اب اِس زمانے کی کمائی کو کون کمائی کہہ سکتا ہے۔ پچھلے سال رانی کھیت کے

ایک جنگل کے ٹھیکے میں میرا بارہ لاکھ ٹوٹ گیا۔"

"میں کشمیر کے ٹھیکے میں نو لاکھ گنوا چکا ہوں۔"

"ٹنڈر کا بھاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے جو جنگل دو لاکھ میں آتا تھا۔ اب دس لاکھ میں آتا ہے۔ حکومت ہم لوگوں کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔" ہیرانند ساہ آہ بھر کر بولا۔

"آفیسر لوگ بے ایمان ہوتے جا رہے ہیں۔ رشوت لے کر بھی کام نہیں کرتے!" سکھ بیر اُداس لہجے میں بولا۔

"اب کمائی میں برکت نہیں رہی۔!"

"تم بالکل درست کہتے ہو سیٹھ!"

"نوکر کیسے کام چور ہوتے جا رہے ہیں!" ہیرانند ساہ بولا۔ "وہسکی آرڈر کر دو۔ کوئی نظر نہیں آتا۔ سارا بار خالی ہے۔ بھگوان جانے یہ نوکر کہاں جا کے مر گئے ہیں۔"

"یہاں کوئی کسی کی پوچھ تاچھ کرنے والا نہیں ہے۔ ہمارا تال کلب اب آوارہ گردوں کا کلب ہوتا جا رہا ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے۔ دس روپے دے کر ممبر ہو جاتا ہے۔ اس کلب کی کوئی عزت نہیں رہی!"

ریذیڈنشل کلب کی بات اور ہے!" سکھ بیر بولا۔ "صرف گنے چنے آدمی ممبر ہو سکتے ہیں۔ آدمی جب جی چاہے گھر سے بھاگ کر کلب میں پناہ لے سکتا ہے۔ ایک رات باہر رہے دس رات باہر رہے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہاں روز رات کو گھر جانا پڑتا ہے۔"

وہ دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ پی کر چپ ہو گئے۔ اپنی اپنی اُداسیوں

میں کھوئے ہوئے۔ یکایک سُکھ بیر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ میز پہ آگے جھک کر بولا۔ "سیٹھ! ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ اگر تم ہاں کر دو تو؟"

"ارے تم سے کیا ناں ہے۔ تم بولو۔ میں تو ہمیشہ ہی سے تم کو دل ہی دل میں پسند کرتا رہا ہوں۔ تم مانو گے نہیں۔ لیکن سچ کہتا ہوں۔ اکثر پی کر سچ بول جاتا ہوں۔ دس دفعہ اپنے دوستوں میں اقرار کر چکا ہوں۔ کہ آدمی دیکھا تو سکھ بیر۔ آٹھ آنے لے کر آیا۔ کماؤں کی وادی میں، اکیلا آیا۔ اور آٹھ آنوں سے لاکھوں بنا گیا۔"

"ساہ جی!" سُکھ بیر اپنی تعریف سے خوش ہو کر بولا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ خدا نے تم کو بہت بڑا دل دیا ہے۔ ارے چھ عورتیں وہی رکھ سکتا ہے۔ جس کا دل بڑا ہو۔ میں تو کہتا ہوں۔ کیوں نہ ہم دونوں مل کر اس کلب کے سامنے جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک ریذیڈنشل کلب کھڑا کر دیں! —— لارڈز کلب!!"

لارڈز کلب! —— ہاہا! —— کیا آئیڈیا ہے؟ داد دیتا ہوں —— سُکھ بیر! ——"

"آپ کا بچہ ہوں!" سُکھ بیر عاجزی سے بولا۔

"نہیں تم میرے بھائی ہو۔ آج سے تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ ہم دونوں مل کر لارڈز کلب بنائیں گے۔ ایک سو کمروں کا ریذیڈنشل کلب فرسٹ کلاس، اپ ٹو ڈیٹ، رئیسی ٹھاٹ —— آخر یہ لکڑی کے کھوکھے کس دن کام آئیں گے؟"

اتنا کہہ کر اس نے اپنے لکڑی کے دو بکسوں پر نظر ڈالی۔ جو نوٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور پھر ان کے مقابل ان دو بکسوں پر جو سُکھ بیر کے تھے۔ اور اس کے ذہن میں ریذیڈنشل کلب کا محل کھڑا ہوتا گیا۔ اور اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر سُکھ بیر کا

منہ چوم لیا۔ اب وہ دونوں کنول کو بالکل بھول چکے تھے۔

(۷)

لارڈز کلب، تال کلب کے عین سامنے واقع ہے۔ اور آج کل ہندوستان کا بہترین رہائش کلب سمجھا جاتا ہے۔ پہلے ہی سال ساہ شکھ بیرانیڈ کو نے سات لاکھ رُوپے کمائے۔ جیسا کہ اُن کا شروع ہی سے اندازہ تھا۔

کنول نے رزاق سے شادی کر لی ہے۔ جیسا کہ اُس کا شروع ہی سے ارادہ تھا! کنول جب کبھی اُس واقع کو یاد کرتی ہے تو اُس کے ذہن میں ساہ اور شکھ بیر کی صورتیں نہیں اُبھرتیں اُسے صرف لکڑی کے دو کھوکھے یاد آتے ہیں۔ جن میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔!

کریم خان

باندرے اور کارلایل روڈ کے نکڑ پر فتح محمد سگریٹ فروش کی دوکان سے فضل نے جہاز مارکہ بیڑی کا ایک بنڈل خریدا اور ایک بیڑی سلگا کر اور اس کے دو کش زور سے لے کر بس کے اڈے کو واپس جانے لگا۔ تو فتح محمد نے اسے روک کر کہا۔

"دیکھ وہ کریم خاں آرہا ہے۔ تجھے اس سے ملاتا ہوں۔ مجھے کا آدمی ہے۔ ایسا آدمی تو نے جندگی میں نہیں دیکھا ہوگا۔"

فضل نے زور کا ایک کش لے کر آنے والے کی طرف غور سے دیکھا —— پھر بولا —— "ہاں آج کل اسے ہر روز اِدھر گھومتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ کیا کرتا ہے یہ؟"

"ڈرائی فروٹ کا تھوک دھندا کرتا ہے۔" فتح محمد نے فضل کو بتایا۔ "کھانے پینے والا کھلے دِل کا آدمی ہے۔ اپنا بہت یار ہو گیا ہے۔ اب تو خط پتر بھی میرے

پیتے پر منگاتا ہے۔ ہر روز میرے پاس آتا ہے۔"

فتح محمدؐ کی آواز میں غرور کا ایک ہلکا سا شائبہ تھا۔ فضل کچھ کہنے والا ہی تھا۔ کہ اتنے میں کریم خان بالکل قریب آ گیا۔ چھ فٹ کا اونچا کڑیل آدمی۔ رنگ چمکتے ہوئے تانبے کی طرح۔ مونچھیں گھنی اور کھڑی۔ شلوار قمیض بالکل صاف ستھری دھلی دھلائی۔ کہیں پر نسوار کا نشان تک نہ تھا۔ کریم خان لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، "السلام علیکم" کہتا ہوا، آگے بڑھ آیا اور دوکان کے سامنے سڑک کے کنارے بچھے ہوئے لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ جہاں سے ٹکرا کا نظارہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ پھر اس نے ایک ریشمی رومال نکال کر اپنا منہ پونچھا اور لنگی کلاہ اتار کے فتح دین کے حوالے کیا۔ جس نے اسے دوکان پر سیگریٹ کے ڈبوں کی ایک قطار کے اوپر رکھ دیا۔

کریم خاں اپنا منہ پونچھ کر بولا "بڑی گرمی ہے!"

"یہ فضل ہے ——" فتح محمد نے تعارف کراتے ہوئے کہا —— "یہ سیٹھ مولادینا کے بنگلے کا چوکیدار ہے۔"

کریم خان نے بڑی گرم جوشی سے فضل سے مصافحہ کیا۔ ابھی وہ اپنے نئے ملاقاتی سے کچھ کہنے والا تھا کہ فتح محمدؐ نے ایک خط آگے بڑھا کر کریم خان سے کہا۔ "تمہاری چٹھی آئی ہے ——"

کریم خان نے پوسٹ کارڈ اپنے ہاتھ میں لیا۔ جلدی سے اس پر نگاہ ڈالی۔ اور پھر انتہائی بے زاری سے اسے اپنے سر کے اوپر سے اچھال کر پھینک دیا —— خط ہوا میں اڑتا ہوا اس کے پیچھے جا گرا۔

فضل نے خط اٹھاتے ہوئے کہا —— "کیا بات ہے؟"

"گھر والی کا خط ہے ۔" کریم خان نے لاپروائی سے کہا ۔

"گھر والی کا خط نہیں پڑھو گے ؟" فضل نے حیرت سے پوچھا ۔

"پڑھ کر کیا کروں ۔ ہر دُوسرے تیسرے روز خط لکھتی ہے ۔ اور خط میں پیسہ مانگتی ہے ۔" کریم خان نے غصّے سے کہا ۔

"سب گھر والیاں پیسہ مانگتی ہیں ۔" فضل نے ایک ایسے آدمی کے لہجے میں کہا ۔ جس نے کئی بار خود کشی کا ارادہ کر کے ترک کر دیا ہو ۔ اُس کی ایک بیوی تھی اور چھ لڑکیاں تھیں اور اُن کی آنکھوں کے نیچے کئی تاریک حلقے تھے ۔ وہ ایسے انسان کی آنکھیں تھیں جس نے سب کچھ منظور کر لیا ہو ۔

"پیسہ تو میں بھیجتا ہُوں لالے ! مگر ہر روز نہیں بھیج سکتا ۔ تیسرے چوتھے مہینے دو تین ہزار کی رقم بھیج دیتا ہوں ۔ کیا یہ کم ہے ؟"

"کم نہیں ، یہ تو بہت ہے ۔" فضل نے خط واپس کریم خان کو دیتے ہوئے کہا ۔ !

کریم خان نے خط لے کر پھر ہوا میں پھینکتے ہُوئے کہا ۔ "عاجز کر دیا ہے اس عورت نے اس سے تو میری دوسری بیوی ہی اچھّی تھی ۔"

خط لہراتا ہُوا فٹ پاتھ سے نیچے سڑک پر گر گیا ۔ فضل پھر اُسے اُٹھانے کے لئے لپکا ۔ تو فتح محمد نے پُوچھا ۔

"تمہاری دُوسری بیوی کو کیا ہُوا ؟"

"اُسے دق ہو گیا ۔" کریم خان غصّے سے بولا ۔ "اور اُسے دِق اس لئے ہُوا ۔ کیوں کہ میری پہلی بیوی اُسے مارتی تھی ۔"

"تمہاری پہلی بیوی دوسری بیوی کو مارتی تھی۔ تو تم نے اُسے کیوں نہیں روکا؟"
فضل نے خط اُٹھاتے ہوئے پُوچھا۔

"کیسے روک سکتا تھا۔؟" کریم خان بپھر کر بولا۔ "وہ مجھ سے عمر میں نو سال بڑی تھی۔ میں سات سال کا تھا اور وہ سولہ سال کی تھی۔ جب میرے باپ نے خانم سے میری شادی کر دی۔ اور شادی کے بعد خانم مجھے مارنے لگی۔ کیوں کہ میں سات سال کا تھا اور وہ سولہ سال کی تھی۔ مگر میں سب کچھ سہہ لیتا ہوں، کسی کی دھونس نہیں سہہ سکتا۔ اس لئے جب میں بڑا ہُوا۔ تو میں نے فوراً دوسری شادی کر لی۔ فرخندہ سے، اب خانم مجھے چھوڑ کر فرخندہ کو پیٹنے لگی۔ تو فرخندہ کو تپ دق ہو گیا۔ اور میں نے گھر چھوڑ دیا۔ اور اپنی دوسری بیوی کو لے کر سُورت آ گیا۔ اور ڈرائی فروٹ کا دھندا کرنے لگا۔ مگر سُورت آ کر بھی میری بیوی کی صحت ٹھیک نہ ہوئی۔ اُسے ہر روز تپ رہنے لگا اور راتوں کو وہ زور زور سے کھانستی تھی۔ وہ دن بدن پیلی نڈھال اور بدصورت ہوتی گئی۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اور مجھے اُس سے خوف آنے لگا۔ اور میں راتوں کو اس کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے سے ڈرنے لگا۔ اللہ پاک کی قسم۔ وہ بالکل چڑیل دکھائی دیتی تھی۔ چڑیل، اور ایک چڑیل سے ایک آدمی کا بچہ کیسے محبت کر سکتا ہے حالانکہ جب میں نے اُسے پہلی بار چارسدے میں دیکھا تھا۔ تو وہ بڑی خوب صورت تھی۔ اور سر پہ پانی کا گھڑا رکھے اپنی پتلی کمر لچکاتی ہوئی گھر جا رہی تھی۔ اور میں فوراً اُس پر ریجھ گیا تھا۔ اور فوراً میں نے پیغام دے کر اُس سے شادی کر لی تھی۔ مگر اب میں کیا کرتا، مجھے تو اُس سے ڈر لگتا تھا مولا کی قسم۔"

"تو تم نے اس کا علاج نہیں کیا؟" فتح محمد نے پوچھا۔

"بہت کیا۔ بہت کیا۔ اپنی بساط سے زیادہ کیا۔ بڑے ڈاکٹروں، حکیموں ہویدوں کا علاج کیا۔ مگر کسی سے کوئی افاقہ نہ ہُوا اور وہ دِن بدن ایک بدشکل بھتنی کی طرح دکھائی دینے لگی۔ آخر مجھ کو کسی نے بتایا کہ سُورت سے ساٹھ میل دُور جوراگڑھ کے گاؤں میں ایک کامل حکیم رہتا ہے۔ جو اللہ کے حکم سے مایُوس مریضوں کو بھی شفا دیتا ہے۔ جوراگڑھ کا گاؤں سُورت سے ساٹھ میل دُور ہے۔ وہاں پر کوئی موٹر نہیں جاتی۔ ریل نہیں جاتی۔ مگر میں اللہ کا نام لے کر پیدل چل پڑا۔ اور چلتے چلتے فرخندہ سے کہہ گیا کہ اب کے ایسے حکیم کی دوا لاؤں گا جس سے تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ سُن کر فرخندہ بہت خوش ہوئی اور اُس نے میرے سفر کے لئے ایک مُرغ مُسلّم تیار کیا۔ کباب اور پراٹھے بھی۔ کیوں کہ دو دن کا سفر تھا۔

دو دن کے بعد شام کے ٹائم، جب میں حکیم جی کے گھر پہنچا۔ تو وہ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھر کے آنگن میں ایک چوکی پر بیٹھے تھے۔ میں نے جاتے ہی ان کے پاؤں پکڑ لئے اور خدا اور رسُول اور بڑے پیر کا واسطہ دے کر اُن سے فرخندہ کے علاج کے لئے دوا دارو دینے کو کہا۔ حکیم صاحب مان گئے اور مجھ سے فرخندہ کی بیماری پُوچھنے لگے۔ پُوچھ تاچھ کے بعد وہ دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے اندر سے کاغذ اور قلم منگایا اور نسخہ لکھنے لگے۔

جب وہ نسخہ لکھ رہے تھے۔ تو میں اُن کے گھر کے آنگن میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک لڑکی آئی۔ اور دیوار سے لگی لوکی کی بیل سے لوکیاں توڑنے لگی۔ وہ مجھے اچھی لگی۔ گوری گوری باہوں والی۔ چھریری۔ چھمک سی لڑکی۔ لوکیاں توڑتے ہوئے وہ مجھے بہت اچھی لگی۔ تو میں نے حکیم صاحب سے پُوچھا۔

"یہ لڑکی کون ہے؟"

تو وہ بولے ــــ "یہ میری لڑکی ہے۔"

تو میں بولا ــــ "حکیم صاحب نسخہ مت لکھیئے۔ اس لڑکی سے میرا نکاح کر دیجئے۔ میں اپنی دُوسری بیوی سے تنگ آچکا ہوں۔ اُس کی شکل سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

حکیم صاحب پہلے تو بہت چونکے اور گھبرائے۔ پھر جب انہوں نے اَتہ پتہ، حسب نسب، خاندان، آمدنی سب دریافت کر کے اچھی طرح سے اطمینان کر لیا۔ تو میرا نکاح اپنی لڑکی سے کر دیا۔ نکاح کے بعد میں پانچ دن جور اگڑھ کے گاؤں میں رہا۔ اور پھر واپس سُورت آگیا۔

گھر آنے پر فرخندہ نے مجھ سے پُوچھا "میرے لئے دوا لائے؟"

میں نے کہا "دوا تو نہیں لایا ہوں۔ البتہ شادی کر کے آیا ہوں۔"

اِس پر وہ غریب بہت روئی پیٹی۔ مگر آخر کو اس نے صبر کر لیا اور بولی۔ "تم نے اچھا کیا۔ جو نکاح کر لیا۔ میں اب تمہارے کسی لائق نہیں رہی۔ اور اب تو میں چند دنوں کی مہمان ہوں۔ آج مرجاؤں۔ کل مرجاؤں زندگی کا کیا بھروسہ۔ تم نے اچھا کیا۔ جو نکاح کر لیا۔ مگر اس کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

میں نے گرج کر کہا۔ "تمہارے جیتے جی میں اُس کو اِس گھر میں لاؤں گا؟ ایسا کمینہ نہیں ہوں۔ جب تک فرخندہ اس گھر میں رہتی ہے۔ کوئی دوسری عورت یہاں نہیں آئے گی۔"

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا۔ اور اُس فرخندہ کا سُوکھا سانولا قابلِ رحم چہرہ دیکھ کر یہی کہنے کو میرا جی چاہا تھا۔ اور اُس وقت جب میں نے یہ الفاظ کہے۔ مولا کی قسم

میرے دل میں اُس وقت کوئی بے ایمانی نہ تھی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ کہ میں مرجان کو یعنی اپنی تیسری بیوی کو اس وقت تک اپنے گھر میں نہ لاؤں گا۔ جب تک بے چاری فرخندہ زندہ ہے۔

مگر ہُوا یہ کہ اس واقعے کے بعد ایک ماہ گزُر گیا۔ دُوسرا ماہ گزر گیا۔ مگر فرخندہ مری نہیں۔ وہ تو اس واقعے کے بعد دو سال زندہ رہی۔ اِدھر میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ دو تین مہینے میں ختم ہو جائے گی اور سب حکیم لوگ ایسا ہی بولتے تھے۔ اور خود اُس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ پر جب دِن پر دن گزرتے گئے۔ اور وہ نہیں مری۔ تو اُدھر حکیم صاحب کے گھر سے خط پر خط آنے لگے۔ حکیم صاحب کے بھی اور مرجان کے بھی۔ کہ جوراگڑھ آ کے اپنی بیوی کو لے جاؤ۔ خدا کی قسم میں سخت شرمندہ ہُوا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں کیا کروں؟ ادھر فرخندہ کو زبان دے چکا تھا۔ اُدھر مرجان کے تقاضے پر تقاضے چلے آ رہے تھے۔ ناچار میں نے ہر مہینے دو سو رُپے بھیجنا شروع کر دیئے۔ تاکہ اس کا منہ بند کر سکوں۔"

"دو سو رُپے ہر مہینے بھیجتے تھے؟" فضل چوکیدار نے حیرت سے پُوچھا——!

"ہاں ہاں! دو سو کیا تین سو چار سو بھی بھیج سکتا تھا۔ ڈرائی فروٹ کا دھندا تو بہت اچھا ہے۔ اور یہاں بمبئی میں تو سُورت سے بھی اچھا ہے۔" کریم خان نے اقرار کیا۔

"پھر کیا ہُوا؟" فتح محمد نے پُوچھا۔

"پُورے پندرہ مہینے میں مرجان کو دو سو روپے مہینہ بھیجتا رہا۔ پھر دو مہینے

بیچ میں نہیں بھیج سکا۔ مگر مرجان کے مُنہ کو تو چاٹ لگ چکی تھی۔ اس نے ایک مہینہ انتظار کیا۔ دوسرے مہینے جو اگر دھ چھوڑ کر سُورت میرے گھر آدھمکی۔ اب وہ خود آگئی تو میں کیا کرتا۔ کیسے اُسے گھر نہ رکھتا اور ابھی فرخندہ مری نہیں تھی۔ مولا کی قسم میں بہت شرمندہ ہوا۔ مگر فرخندہ نے مجھے ڈھارس دی۔ مجھے بہت سمجھایا بجھایا۔ بولی۔

"مرجان تیری بیوی ہے۔ اُسے اپنے پاس رکھ۔ میں تم دونوں کے رہنے کے لئے اس گھر میں الگ کمرہ ٹھیک کئے دیتی ہوں۔ میرے ساتھ اب تیرا رہنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میرا کیا ہے۔ چند لمحوں کی مہمان ہوں۔ آج مرجاؤں کل مرجاؤں۔"

اور اِس واقعے کے پورے پانچ مہینے کے بعد وہ بے چاری چل بسی۔ زندہ رہنے کو شاید ابھی وہ اور زندہ رہتی۔ مگر اس مرجان نے اس کا دُودھ بند کر دیا تھا۔ انڈہ اور پھل سب کچھ۔ پھر وہ کیسے زندہ رہتی؟ سارے گھر پر اُس نے قبضہ جما لیا تھا۔ گھر کے خرچ کے علاوہ وہ مجھ سے ہر مہینہ دو سو رُوپیہ الگ لیتی رہی۔ بولی۔

"یہ تو میرا پاکٹ منی ہے۔ میکے سے چلا آرہا ہے۔ یہ میں ہر ماہ لوں گی۔"

اور میں یہ سوچ کر دیتا رہا کہ فرخندہ مرے گی۔ تو میں مرجان کا جیب خرچ بند کر دوں گا۔ مگر فرخندہ کے مرنے کے بعد بھی مرجان برابر مجھ سے پاکٹ منی وصول کرتی رہی—— مولا کی قسم بڑی لالچی اور ذلیل عورت ہے۔ اور اُس وقت لڑکیاں توڑتے وقت تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی تھی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ شادی کے بعد ایسی نکلے گی۔ اپنی بھی کیا قسمت ہے۔ فتح محمد! تین بار شادی کی۔ مگر تینوں بار شادی کا سکھ نہیں ملا۔ ورنہ کریم خان کے پاس کیا نہیں ہے۔ گھر ہے۔ صحت ہے۔ روزگار

ہے۔ دولت ہے۔ اِس دُنیا میں جو جس کو چاہیئے۔ وہ سب ہے۔ مگر خدمت کرنے والی بیوی نہیں ہے۔ اب تو میں اُس کو چھوڑ کے سورت سے بمبئی چلا آیا ہوں۔ اور خدا کے فضل سے میرا کاروبار یہاں سورت سے بھی اچھا ہے۔ مگر گھر کا سُکھ نہیں ہے۔ تو سب کچھ بے فائدہ ہے۔"

فضل جو اس قصّے کے دوران میں کریم خان کے خط کو سڑک سے اُٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے کر اُسے اپنی اُنگلیوں میں نچا رہا تھا۔ اب آگے بڑھا اور خط کو پھر کریم خان کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لو۔ سنبھالو۔ اپنا خط۔"

کریم خان نے پھر بڑی بے قراری سے خط کو ہوا میں اُچھال دیا اور بولا —— "لعنت بھیجو اِس خط پر یار! پیسہ پیسہ پیسہ۔ پیسے کے سوا اُس عورت کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ بندہ پیسے بھی خرچ کرے۔ پھر بھی اُسے خوشی نہ ملے۔ تو ایسی عورت کے ساتھ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہٹاؤ۔"

خط ہوا میں اُچھل کر ایک لڑکی کی اوڑھنی میں اٹک گیا۔ جو بڑی تیزی سے سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل تھی۔ دوسرے ہاتھ میں سبزی ترکاری سے بھرا ہوا تھیلا تھا۔ لڑکی خط کے اٹک جانے سے ٹھِٹھک گئی۔ پھر اُس نے چونک کر کریم خاں اور فضل کی طرف دیکھا۔ اور شرم سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اُس نے جلدی سے گردن کو خمیدہ کر کے اور کندھے اُچکا کر خط کو اوڑھنی سے گرا دیا۔ پھر وحشی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

خط زمین پر پڑا تھا۔

کریم خان نے بنچ سے اُٹھ کر خط کو زمین سے اُٹھا لیا۔ مگر اُس نے خط پڑھا

نہیں۔ چند لمحوں تک غائب ہوتی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اور جب وہ نکڑ پر غائب ہو گئی۔ تو وہ مڑ کر فتح محمد سے پوچھنے لگا: "یہ کس کی لڑکی ہے؟ میں اس کو ہر روز ادھر سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔"

فضل نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا: "یہ میری لڑکی ہے۔"

کریم خاں نے فوراً اُس کے گھٹنوں کو پکڑ کر کہا۔

"مولا کی قسم! بس ایسی ہی لڑکی میں اپنے لئے چاہتا تھا۔ بالکل ایسی۔ بالکل یہی۔ فتح محمد۔ اے فتح محمد۔ اگر تجھ کو میری زندگی عزیز ہے۔ تو اپنے دوست کو بول دے۔ کہ اپنی لڑکی کا نکاح مجھ سے کر دے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

شیطان کا استعفیٰ

ایک روز شیطان خدا کے روبرو حاضر ہوا اور سر جھکا کے بولا "میرا استعفیٰ حاضر ہے
میں اس کام سے عاجز آ گیا ہوں! ہر روز لوگوں کو جہنم کی آگ میں جلانا، لہو اور پیپ
کے کڑاہوں میں اُبالنا، چابک مار مار کر اُن کی کھال اُدھیڑنا، ہر لمحہ لوگوں کو گناہ پر
اُکسانا، کتنا مشکل کام ہے میرا۔ اور جب سے یہ دُنیا بنی ہے، جب سے میں یہ کام کر رہا ہوں
اب میں یہ کام کرتے کرتے بالکل تھک گیا ہوں۔ ذرا غور فرمایئے کہ سب سے مشکل کام
آپ نے مجھے سونپا ہے۔ ورنہ آپ کے دوسرے فرشتے دن رات جنّت کی ٹھنڈی
ہوائیں کھاتے ہیں۔ آپ کی عبادت میں مگن رہتے ہیں اور ہر لحظہ لوگوں کو نیکی کا درس
دیتے ہیں۔ کیسا عمدہ اور دلچسپ اور خوبصورت کام ہے ان کا۔ یا خدا! میرے مالک!
میرے گاڈ! میرے بھگوان! رب عظیم! میں لوگوں کو گناہ پر اُکساتے اُکساتے تھک
کر چور ہو چکا ہوں۔ میرا استعفیٰ قبول فرمایئے اور مجھے اس روز روز کے جہنّم سے نجات

دلوائیے ؟"

خداوند کریم کے دل میں رحم آگیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ شیطان کے پر اُسے واپس کر دیئے جائیں۔

جب شیطان کو اس کے پر واپس مل گئے تو خدا نے اس سے کہا: "آج سے تو ہر ایک کو نیکی کا سبق دے گا۔ اس وقت تو سیدھا یہاں سے موضع لکشمن پتن چلا جا جہاں کرم دین کسان کی لڑکی زہرہ کا سودا ہو رہا ہے۔ کسی طرح اس سودے کو روک دے!"

شیطان نے ایک معمر سفید ڈاڑھی والے بزرگ کا بھیس بدلا اور موضع لکشمن پتن میں کرم دین کسان کے گھر پہنچ گیا۔ اور اسے سمجھانے لگا۔ "اگر تم نے اپنی لڑکی بیچی تو تم پر خدا کا قہر نازل ہوگا!"

"فی الحال تو بنیئے کا قہر نازل ہے!" کرم دین مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ اگر میں اپنی لڑکی نہ بیچوں تو زمین بیچوں گا اور اگر زمین بیچوں گا تو میں اور میری بیوی اور میری پانچ لڑکیاں اور دو لڑکے کھائیں گے کہاں سے؟ تم نے یہاں کی زمین دیکھی ہے؟ سخت اور پتھریلی اور بھُربھُری لال مٹی والی۔ اس زمین میں مکا اور باجری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ دن رات کی محنت کے بعد بھی ایک وقت فاقے سے گزرتا ہے۔ اب اگر زمین بھی بیچ دیں گے تو سیدھے سیدھے مر جائیں گے۔ کیا تم پانچ لڑکیوں، دو لڑکوں اور ایک بیوی کے قتل کے ذمّہ دار بننے کے لئے تیّار ہو؟"

شیطان نے کانوں پر ہات رکھا۔

"تو تم مجھے سمجھانے کے بجائے لالہ مصری شاہ کو سمجھاؤ جو ہمارے گاؤں کا بنیا ہے اور جس کا ساڑھے سات سو روپیہ کا قرضہ مجھے ادا کرنا ہے۔ اگر وہ اپنا قرضہ مجھے

معاف کر دے تو میں اپنی زہرہ کا سودا نہیں کروں گا۔"

شیطان نے اپنے ماتھے پر تلک لگایا۔ گیروے رنگ کی ایک دھوتی پہنی، کاندھے پر رام نام کا انگوچھا رکھا اور ہاتھ میں مالا لے کر لالہ مصری شاہ کے گھر پہنچ گیا۔ لالہ مصری شاہ اُس وقت اپنے گھر کے آنگن میں تلسی کی پوجا سے فارغ ہو کر کھاٹ پر بیٹھے ہی تھے کہ شیطان نے آلکھ جگائی۔

اس کی بات سن کر لالہ مصری شاہ اپنے لہجے میں مصری گھولتے ہوئے بولے "پنڈت جی، آپ کیوں بار بار بھگوان کا نام لے کر مجھے ڈرا رہے ہیں لڑکی کا سودا میں نہیں کر رہا ہوں۔ کرم دین کر رہا ہے۔ اس کی سزا جزا، گناہ ثواب وہ بھگتے گا۔ میں کیا جانوں۔ مجھے ساڑھے سات سو روپے چاہئیں۔ وہ میرا قرضہ واپس کر دے، بس پھر وہ جانے اُس کا کام"!

"لیکن اگر تم ساڑھے سات سو روپے معاف کر دو تو وہ اپنی لڑکی نہیں بیچے گا!" شیطان نے اُسے سمجھایا۔

"کس کس کا قرضہ معاف کر دوں؟" بنیئے نے اپنی لال کتاب کھول کر اُسے دکھائی۔ "یہ چوپڑی دیکھیے، سندر داس نے دو ہزار لے رکھے ہیں، بجے نے پانسو ساٹھ روپے، گورو دیال نے آٹھ سو روپے، مہتاب رلائے تین ہزار کھائے بیٹھا ہے۔ اس گاؤں کے کسانوں پر میرا اکیس ہزار کا قرضہ مع سود کے نکلتا ہے۔ سب کو معاف کر دوں تو خود کھاؤں کہاں سے؟ اور گھر کیسے چلاؤں؟"

"تم اور کسی کا قرضہ بے شک معاف نہ کرو، صرف اس کا کر دو جو تمہارے قرضے کی وجہ سے اپنی لڑکی کا سودا کرنے پر مجبور ہے۔"

"مجبور تو میں بھی ہوں، میں نے دو پن چکیوں کے لائسنس کی درخواست دے رکھی ہے اور مجھے اس لائسنس کے لئے ساڑھے سات سو روپے سات دن کے اندر اندر سرکاری خزانے میں داخل کرانا ہوگا۔ کرم دین کسان کی زمین کی قرقی کے کاغذ میرے پاس ہیں اگر اس نے چار دن کے اندر اندر میرا روپیہ واپس نہ کیا تو میں اس کی زمین قرق کرا کے اپنے لائسنس کا روپیہ بھر دوں گا۔"

شیطان نے مالا جپتے ہوئے کہا۔ "تم کو شرم نہیں آتی لالہ مصری شاہ! ان ساڑھے سات سو روپیوں کے عوض تم ایک مسلمان لڑکی کو اپنے گھر میں لاؤ گے۔ اپنا دھرم بھرشٹ کرو گے؟"

"رام رام! کیسی باتیں کرتے ہو پنڈت جی۔" لالہ مصری شاہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "میں ایسی حرکت کی تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لڑکی کو میں اپنے گھر نہیں لا رہا ہوں۔ دراصل اُس لڑکی کا سودا خوجہ بدرالدین سے ہو رہا ہے جو لکشمن پتن کے پل کے پار آڑھت کی دکان کرتا ہے۔ اس کی چار بیویاں پہلے سے موجود ہیں۔ مگر وہ اس پر بھی زہرہ کے لئے ساڑھے سات سو دینے کے لئے تیار ہے۔ بود اصرف اتنا ہے کہ کرم دین ساڑھے سات سو کے بدلے خوجہ بدرالدین کو اپنی لڑکی دے گا اور خوجہ بدرالدین لڑکی کے بدلے ساڑھے سات سو کرم دین کو دے گا اور کرم دین اپنے قرضے کے بدلے ساڑھے سات سو مجھے دے گا۔ اور میں اپنے لائسنس کے بدلے ...."

"بس، بس!" شیطان گھبرا کر بولا۔ "یہ بتاؤ کیا یہ گندا سودا کسی طرح رُک نہیں سکتا؟"

"خوجہ بدرالدین چاہے تو رُک سکتا ہے. آخر اس کو پانچویں شادی کرنے کی ضرورت کیا ہے! چار تو اس کے گھر میں پہلے سے موجود ہیں. وہ اگر یہ شادی نہ کرے تو یہ سودا آسانی سے رُک سکتا ہے؟

❖ ❖ ❖

"مگر میں کہاں پانچویں شادی کر رہا ہوں؟ خوجہ بدرالدین آڑھتی نے شیطان کو سمجھایا۔ یہ درُست ہے. میری چار بیویاں ہیں۔ مگر سب سے پہلی عمر رسیدہ ہو چکی ہے. گھر کا کام کاج تک نہیں کر سکتی. میں اُس کا مہر ادا کر کے اس کا خرچہ باندھ کے الگ کر دوں گا اور تب زہرہ سے شادی کروں گا!"

"مگر تمہاری عمر پینسٹھ برس کی ہو چکی ہے. اس بڑھاپے میں تم کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟ شیطان نے اُس سے پوچھا۔

"چاروں بیویوں سے آج تک کوئی لڑکا پیدا نہیں ہوا. سبھی لڑکیاں جنتی ہیں" خوجہ بدرالدین مایوسی سے بولا "مجھے لڑکا چاہیئے. اپنا نام لیوا. خاندان کا چلانے والا ــــ!"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ زہرہ سے لڑکا ہی پیدا ہو" شیطان نے کہا.

"اللہ بڑا کارساز ہے؟ خوجہ بدرالدین نے ہات اوپر اُٹھا کے کہا" وہ مجھے ضرور میری مراد دے گا"

شیطان نے پھر پوچھا" کیا کسی طرح یہ سودا رُک نہیں سکتا؟"

"کوئی زبردستی کا سودا تو ہے نہیں جناب! خوجہ بدرالدین نے کسی قدر تلخی سے کہا. لڑکی بالغ اور جوان ہے. اپنا بھلا بُرا خود سوچ سکتی ہے. اگر وہ اس شادی

کے لئے راضی نہ ہو تو میں یا اُس کا باپ، اُسے شادی کے لئے کیسے مجبور کر سکتے ہیں!"

شیطان نے ایک خوبرو گھبرو نوجوان کا بھیس بدلا اور زہرہ سے ملنے کے لئے چلا گیا۔ جو اُس وقت "نکی ڈھکی" کی بیریوں کے سائے میں ایک ٹھنڈے چشمے کے کنارے بیٹھی گھڑا بھر رہی تھی۔ پہلی نظر ہی میں وہ اس گھبرو نوجوان پر عاشق ہو گئی اس کے سنہری گالوں پر حیا کی گلابی رنگت بکھر گئی اور وہ لجا کر چشمے میں پڑے ہوئے گھڑے کو اپنی انگلیوں سے گھمانے لگی۔

شیطان نے اُسے شادی کا پیغام دیا۔

زہرہ گھڑا گھماتے گھماتے رُک گئی۔ نظر بھر کر اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور بڑی کمزور آواز میں بولی "کیا کام کرتے ہو؟"

"کچھ نہیں کرتا" شیطان بولا، "خدا کا نام لیتا ہوں"

"خُدا کا نام تو سبھی لیتے ہیں" زہرہ اُداس ہو کر بولی "پھر تم مجھے کھلاؤ گے کیسے؟"

"ہم دونوں مل کر محنت کریں گے"

"محنت تو میں نے ہمیشہ کی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گھر میں اور کھیتوں میں آج تک دن رات محنت کرتی آئی ہوں۔ اس محنت نے مجھے پھٹے چیتھڑے اور ایک وقت کا فاقہ دیا۔ اس محنت سے اب میں عاجز آ چکی ہوں۔ اب مجھے ایسا شوہر چاہیئے جو میرے لئے محنت کرے!"

شیطان دیر تک چپ رہا۔ پھر آہستہ سے بولا "زہرہ، تم جوان اور خوبصورت

ہو ، ذرا سوچو، کیا تم اُس پینسٹھ برس کے بڈھے سے شادی کر کے خوش رہ سکوگی کیا تمہاری رُوح کو اس بات سے اطمینان ہوگا۔ کہ تم ایک انسان ہو کر چاندی کے چند سکّوں کے بدلے فروخت کی جا رہی ہو؟"

"وہ مجھے گھر دے گا، کپڑا دے گا، دو وقت پیٹ بھر کے روٹی تو دے گا"۔ زہرہ کا چہرہ اُمید سے کھِل گیا۔

"مگر وہ بڈھا بدصورت پینسٹھ برس کا"۔ شیطان نے زہرہ کا ہات اپنے ہات میں لے کر کہا" ذرا سوچو، تم اس سے کیسے خوش رہ سکوگی؟"

زہرہ نے آہستہ سے اپنی لانبی لانبی پلکیں اوپر اُٹھائیں اور شریر نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی:" خوش ہونے کے لئے میں کبھی کبھی تم سے مل لیا کروں گی۔ آؤ گے نا مجھ سے ملنے کے لئے؟ چھپ کے؟ شادی کے بعد؟"

زہرہ نے اِک ٹھنڈی سانس بھر کے اپنا سینہ اُس کے سینے پر رکھ دینا چاہا۔ مگر شیطان جلدی سے ہات چھُڑا کے وہاں سے بھاگ گیا۔

وہ تھانے دار گوردیال سنگھ کے پاس پہنچا اور اُس سے کہنے لگا۔ میں ایک شریف شہری کی حیثیت سے آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سودے کو روک لیجئے اور ایک لڑکی کی زندگی تباہ ہونے سے بچا لیجئے۔ تھانے دار صاحب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ موضع لکشمن پتن کا کسان کرم دین اپنی لڑکی کا سودا خوجہ بدرالدین سے کر رہا ہے۔ ساڑھے سات سو روپے لے کر وہ اپنی لڑکی کی شادی خوجہ بدرالدین سے کر دے گا اور زہرہ کو پاکر خوجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے کرم دین کو دے گا جو یہ ساڑھے سات سو روپے لے کر لالہ مصری شاہ کو دے گا اور اپنی

زمین چھڑا لے گا۔ کیا اِنسان کی رُوح اب مرلوں اور بگھوں کی صُورت میں بِکی جائے گی؟ اخلاقی اعتبار سے یہ سودا غلط ہے۔ مذہبی اعتبار سے یہ گناہِ عظیم ہے۔ قانونی اعتبار سے بھی یہ جرم ہے! میں آپ کو خبردار کرتا ہوں۔ آپ اِس علاقے کے تھانے دار ہیں۔ آپ اِس خلافِ قانون سودے کو روک دیجئے!"

"میں ہرگز نہیں روکوں گا!" تھانے دار نے شیطان کو سمجھایا۔ "مجھے سارا قصّہ معلوم ہو چکا ہے اور میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جب زہرہ کا نکاح خوجہ بدرالدین سے ہو گا اُس سے چند منٹ قبل خوجہ بدرالدین ساڑھے سات سو روپے اپنے ہات سے اپنی ہونے والی بیوی کے ہات میں دے گا۔ زہرہ وہ رقم لے کر اپنے باپ کے ہات میں دے گی۔ نکاح کے بعد وہی رقم لے کر کرم دین لالہ مصری شاہ کے پاس جائے گا اور وہی ساڑھے سات سو روپے اُسے دے کر اپنا قرض چکائے گا۔ مگر میرے آدمی خوجہ بدرالدین کے نکاح کے وقت موجود ہوں گے اور جو روپیہ خوجہ بدرالدین اس سودے کے عوض کرم دین کو دے گا اُس پر پہلے سے ہمارے خفیہ نشان بنے ہوں گے۔ پس جب نکاح ہو جائے گا اور سودا پکّا ہو جائے گا تو میں ایک ہی ہلّے میں سب کو گرفتار کر لوں گا اور ان پر دُختر فروشی کے سلسلے میں مقدمہ چلاؤں گا۔"

"مگر آپ مقدمہ کیوں چلاتے ہیں؟" شیطان نے پریشان ہو کر کہا۔ "آپ اس خلافِ قانون حرکت کو عمل میں آنے سے پہلے ہی کیوں نہیں روک دیتے؟"

"بڑے چُغد ہیں آپ!" گورودیال سنگھ تھانے دار نے جھلّا کر شیطان سے کہا، "میں ایسا احمق نہیں ہوں کہ اتنے بڑے مقدمے کو یوں آسانی سے ہات سے جانے دوں۔

جس میں خوجہ بدرالدین اور لالہ مصری شاہ اور کرم دین اور زہرہ کو میں ایک ساتھ لپیٹ میں لے سکوں۔ خوجہ بدرالدین سے میں کم سے کم دو ہزار روپیہ رشوت میں لے سکوں گا اور اتنی ہی رقم لالہ مصری شاہ سے اینٹھ لوں گا۔ پھر میں نے سنا ہے کہ زہرہ بہت خوب صورت لڑکی ہے"——

"مگر یہ تو گناہ ہے"۔ شیطان نے گھبرا کر کہا۔

"اُن چار ہزار روپیوں سے میں اپنی لڑکی کی شادی کر سکوں گا۔ بڑی بچّی کی شادی ایک عرصے سے رُکی ہوئی ہے کیونکہ مجھے اس کے جہیز کے لئے معقول رقم چاہئیے۔ اب ایک ہی ہلّے میں سب بندوبست ہو جائے گا —— ایک ہی کیس میں ——"

"ایک لڑکی کی شادی کے لئے آپ دوسری لڑکی کی زندگی تباہ کریں گے؟ یہ تو پاپ ہے!"

"اور شہرت الگ ملے گی جناب!" تھانے دار نے شیطان کو سمجھایا۔ "اتنا بڑا مقدمہ آج تک اس علاقے میں کسی تھانے دار کے ہتھے نہ چڑھا ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ میں اس مقدمے کی کامیابی کے بعد سب انسپکٹر سے انسپکٹر بنا دیا جاؤں"۔

"مگر یہ تو جرم ہے!" شیطان چلّایا۔

"آپ بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہیں؟" تھانیدار نے گرج کر پوچھا۔

"میں خُدا کا بندہ ہوں!" شیطان نے عاجزی سے سر جھکا کے کہا۔ "میں تو لوگوں کو نیکی کا درس دیتا ہوں؟"

یہ سُن کر تھانے دار نے اُسے حوالات میں بند کر دیا۔

❖ ❖ ❖

سات دن کے بعد حوالات سے چھوٹ کر شیطان سیدھا خدا کے حضور میں پہنچا اور اپنے پَر واپس کرتے ہوئے بولا۔ میں نے سوچا تھا کہ میرا کام سب سے مشکل ہے۔ اور فرشتوں کا کام سب سے آسان ہے۔ اب معلوم ہوا کہ میرا کام سب سے آسان ہے اور فرشتوں کا کام سب سے مشکل ہے۔ اس لئے میں اپنا استعفیٰ واپس لیتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فوراً واپس جہنم میں بھیج دیا جائے۔

بچن سنگھ

لِنکنگ روڈ کے اڈّے پر تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔

میں اُن کی طرف غور سے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا اور ابھی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ کس میں بیٹھوں کہ اتنے میں ایک آواز آئی۔ "اِدھر آؤ جی۔ اپنے بچّن سنگھ کی ٹیکسی میں بیٹھو۔ اُدھر کدھر مُنہ اُٹھائے بھگے جا رہے ہو بادشاہو؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹیکسیوں کے اڈّے کے بالکل سامنے ایرانی رستوران کے باہر ایک دُبلا پتلا تیز لہجے اور شریر آنکھوں والا بچن سنگھ اپنی ٹیکسی سے ہات نکالے مجھے اپنی طرف بُلا رہا ہے اور سفید سفید دانتوں سے مُسکرا رہا ہے۔

بچن سنگھ کی صُورت جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں۔ کہ چاہے زندگی میں آپ نے انہیں پہلے کبھی نہ دیکھا ہو لیکن پہلی ہی ملاقات میں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا برسوں کی ملاقات ہے۔ میں جلدی سے ٹیکسی کا پٹ کھول کر اُس

میں بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھنے سے پہلے بچن سنگھ نے فلیگ گرا دیا تھا اور میٹر چالو کر کے لنکنگ روڈ سے گھوڑ بندر روڈ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

"آپ بھول گئے مجھ کو؟ اس دن آپ مجھے بھانڈوپ میں اپنے گھر سے لے کر چینچ پوکلی آئے تھے؟ کوئی تین ماہ کی بات ہے!"

مجھے معلوم تھا کہ میں بھانڈوپ میں نہیں رہتا اور نہ کبھی چینچ پوکلی جاتا ہوں۔ مگر مجھے کہنا ہی پڑا۔ "آں ہاں! یاد آیا۔ خوب یاد آیا۔ کہیئے بچن سنگھ جی۔ مزاج تو اچھے ہیں!"

"واہ گرو کی کرپا ہے۔ مگر آپ تو مجھے بھول ہی گئے تھے۔ اور کسی دوسری ٹیکسی میں بیٹھنے والے تھے!" بچن سنگھ کسی قدر خفا ہو کر بولا "مگر میں تو اپنے گاہکوں کو پہچانتا ہوں۔ ایک دفعہ صورت دیکھ لوں تو زندگی بھر نہیں بھولتا۔ یاد ہے۔ آج سے پانچ ماہ پہلے اگست کی ایک بھیگتی ہوئی شام میں آپ نے قلابے سے ایک لڑکی اٹھائی تھی۔ مس بُوتا والا اس کا نام تھا۔ رات کے دو بجے میں اسے آپ کی مس بُوتا والا کو کھڑا پارسی کے چوک میں چھوڑ کے آیا تھا۔ یاد ہے؟"

اب میں کیا کہتا کہ قلابے سے لڑکی اُٹھانے کی مجھے آج تک حسرت ہی رہی اتنے پیسے ہی کبھی جیب میں نہ ہوئے اور پھر مس بُوتا والا! میری بیوی اگر کہیں سن لے تو مار مار کر مجھے جوتا والا بنا دے۔ مگر بچن سنگھ نے اس فراٹے سے گاڑی گھما کر ایک ٹرک کے قریب سے نکالی کہ میرا سانس اُوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے ہانپتے ہوئے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا "کیا یادداشت ہے آپ کی بچن سنگھ جی! کچھ بھولتے ہی نہیں ہو۔ مگر گاڑی ذرا آہستہ چلاؤ۔"

"مجھو لینے کے دن تو بچن سنگھ پیدا ہی نہیں ہوا" بچن سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔ اور اس خوشی میں گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ "اور پھر وہ چیز بھی اچھی تھی" بچن سنگھ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "بھنے ہوئے تیتر کی طرح خستہ رہی ہوگی کیوں ــــ؟"

یہ کہہ کر بچن سنگھ نے ایسی شریر نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ میں جھینپ گیا اور ٹیکسی پیٹرول لے جانے والی لاری سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ بچن سنگھ لاری والے کو گالیاں دینے لگا۔ دیکھ کر نہیں چلاتے ہیں یہ حرامزادے۔ ابھی تیرے پیٹرول میں ایک تیلی ڈال کر پھونک دوں گا۔ جانے کس احمق نے تجھے لائسنس دے دیا ہے ــــ؟"

"مگر تم تو خود ہی پیچھے دیکھ رہے تھے۔ اپنے گاہک سے باتوں میں مشغول تھے" لاری ڈرائیور بولا، "وہ تو میں نے ایکسی ڈینٹ بچا لیا۔ ورنہ ــــ"

مگر بچن سنگھ نے پوری بات نہیں سنی۔ گاڑی بڑھا کر آگے لے گیا۔ اور جاتے جاتے مجھے کہنے لگا۔ "دیکھ لیا آپ نے؟ یہ لاری ڈرائیور کتنے حرامی ہوتے ہیں۔ بے تحاشا تیز رفتار سے گاڑی چلاتے ہیں۔ نہ آگے دیکھتے ہیں نہ پیچھے اور قصوروار ہم غریب ٹیکسی ڈرائیوروں کو ٹھہراتے ہیں"۔

"بے شک، بے شک، اس میں کیا شبہ ہے؟" میں نے کمزور لہجے میں کہا، حالاں کہ غلطی اسی کی تھی، مگر بچن سنگھ کو ٹوکنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔

"مگر میں نے بھی سالے کی طبیعت صاف کر دی۔ اوئے موڑ توں بڈھے"! بچن سنگھ نے اکدم بریک لگائی۔ مگر پھر بھی سامنے سے گزرتا ہوا بڈھا اس کی ٹیکسی

سے ٹکراتے ٹکراتے بچا!

بچن سنگھ گاڑی کو ریس کرتے ہوئے بولا" اگر میں گاڑی احتیاط سے نہ چلاتا تو یہ بڈھا تو اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ہا ہا ہا۔ کہاں جانا ہے جی؟ آپ کو؟"

میرا جی تو وہیں اترنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر آس پاس کوئی خالی ٹیکسی دکھائی نہ دی اس لئے مجبور ہو کر کہنا پڑا۔ دھوبی تلاؤ جاؤں گا۔ مگر ٹیکسی احتیاط سے چلاؤ بچن سنگھ جی!

بچن سنگھ کو میرا مشورہ پسند نہیں آیا۔ بولا" آپ بھی کمال کرتے ہو بابو جی۔ احتیاط تو ہر ٹیکسی ڈرائیور کے لئے لازم ہے۔ ایکسی ڈینٹ ہو گیا تو آپ کا کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ مگر میری تو ٹیکسی ٹوٹ جائے گی۔ اور ہزاروں کا نقصان الگ ہو گا۔ اور لائسنس الگ ضبط ہو گا اور روزگار سے بھی جائیں گے۔ اپنے لئے تو بڑی مصیبت ہے اس لئے میں ہمیشہ ٹیکسی بڑی احتیاط سے چلاتا ہوں۔ اور ہو۔ یہ گجراتی سیٹھ کا ڈرائیور بڑا پاٹے خان معلوم ہوتا ہے۔ میری گاڑی کو، آپ کے سامنے ——دیکھا آپ نے؟ ناں ناں —— صاف کہیئے —— آپ کے سامنے اُس نے اوورٹیک کیا کہ نہیں میری گاڑی کو؟ میں ایسے نکل جانے دوں گا سالے کو؟ سمجھتا کیا ہے بے تو، بچن سنگھ سے گاڑی آگے لے جائے گا؟"

یہ کہہ کر بچن سنگھ نے ایکسی لیٹر پر جو پاؤں رکھا تو زُوم سے آگے بڑھ کر گجراتی سیٹھ کی گاڑی کے پہلو میں آ گیا۔ اب دونوں گاڑیاں! ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ بچن سنگھ کی ٹیکسی اور گجراتی سیٹھ کی گاڑی اور بچن سنگھ کے مُنہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔

"کیوں بے مدراسی!" بچن سنگھ گجراتی سیٹھ کے ڈرائیور سے کہنے لگا۔ تیری فیئٹ کے مڈگارڈ میں ترچھا پٹی ماروں۔ رانگ سائیڈ سے اوورٹیک کرتا ہے؟"

"کیا بکتا ہے؟" جنوبی ہند کا رہنے والا ڈرائیور بھی طیش کھا کر بولا۔ "ڈرانگ سائیڈ سے تم اوورٹیک کیا میری گاڑی کو دو دفعہ، اور دو دفعہ ہم چپ رہا۔ مگر ہم بھی ڈرائیور ہے، کوئی حجام نہیں ہے! جاستی لفڑا کرے گا تو تیری ماں کا منہ توڑ کے بُڈھیا نہ بنا دے گا!"

اس کے بعد بچن سنگھ نے نہایت نفیس پنجابی میں، نوک پلک سے آراستہ ایسی گالی دی جو مدراسی ڈرائیور کے دل میں گھس کر اس کی سات پشتوں پر حملہ کر گئی۔ جواب میں دوسرے ڈرائیور نے جو اپنے منہ کی مشین گن کھولی تو دہلی سے امرتسر تک پوری پنجابی قوم کا صفایا کر دیا۔ ساتھ ساتھ دونوں ہی گاڑیوں کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ بڑی مشاقی سے دائیں بائیں کی گاڑیوں، لاریوں، ٹرکوں سے بچتے ہوئے وہ دونوں ڈرائیور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان صرف چھ سات انچ کا فاصلہ تھا۔ سٹیرنگ وہیل کی اِک ذرا سی غلط حرکت یا لغزش پر پچاس میل کی رفتار پر چلنے والی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا سکتی تھیں۔ اُدھر گجراتی سیٹھ کا چہرہ فق تھا۔ ادھر میرا دل دھک دھک تھا اور ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ باندرے کا چوک گزر گیا۔ باندرے کی مسجد گزر گئی۔ دونوں گاڑیاں ماہم کریک پر دوڑتی ہوئی چیک ناکے کے قریب ہوتی گئیں۔ ناکے کے بالکل قریب جا کر سڑک کے دو حصے ہو جاتے تھے۔ ایک حصے پر صرف پرائیویٹ گاڑیوں کو گزرنے کی اجازت تھی۔ دوسرے سے لاریاں، بسیں اور ٹیکسیاں گزرتی تھیں۔ مدراسی ڈرائیور گالیاں بکتا ہوا اپنے رستے پر چلا گیا۔

بچن سنگھ نے ٹیکسی سلو کرتے ہوئے مجھے کہا۔ "سالا بھاگ گیا! دیکھا آپ نے؟"

میں نے ہنسنے کی کوشش کی، مگر میرے حلق سے ایک ایسی آواز نکلی جو صرف بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے کسی آدمی کے حلق سے عالمِ نزع ہی میں نکل سکتی ہے۔

چیک ناکے پر پولیس کے سنتری نے بچن سنگھ سے پوچھا: "کا ہے رے بچن سنگھ! کیا مال ہے تیری گاڑی میں؟"

"ایک درجن بوتلیں بھرے کی ڈکی میں رکھی ہیں" بچن سنگھ قہقہہ مار کے بولا، "اور ایک نوٹانک میرے سیٹھ نے پی رکھی ہے اور دو نوٹانک ہیں نے۔ یقین نہ آئے تو سونگھ کر دیکھ لے!"

سنتری زور سے ہنسا۔ "جا، جا۔ مسخری کرتا ہے۔ مگر کبھی تو پکڑا جائے گا بچن سنگھ!"

ہات ہلا کر سنتری نے راستہ دے دیا۔ بچن سنگھ فراٹے سے گاڑی نکال کے ماہم بازار میں لے آیا اور سیدھا شیواجی پارک جانے کے بجائے کھوا گلی میں گھس گیا ـــــ!

"اُدھر کہاں جاتا ہے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"بس ایک منٹ کا کام ہے یہاں" بچن سنگھ نے ایک گندے چھپرے کے قریب اپنی گاڑی روک کر اُترتے ہوئے کہا۔

گاڑی سے اُتر کر اُس نے دو دفعہ ہارن بجایا۔ چھپرے میں سے بنیان اور پتلون پہنے ہوئے سفید بالوں والا ایک بڈھا نکلا۔

ڈکی کھول کر بچن سنگھ نے اس کے ہات میں بھورے رنگ کا ایک بڑا تھیلا تھمایا۔ جب بڈھے نے اُس تھیلے کو اپنے ہات میں لیا تو تھیلے کے اندر سے بوتلوں کے ٹکرانے کی آواز آئی۔

"پُوری بارہ ہیں!" بچن سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

بُڈھے نے اندر جیب میں ہات ڈال کر بڑی رازداری سے اُسے بچن سنگھ کے ہات کی طرف بڑھایا۔ دونوں ہات ایک دوسرے سے پرانے دوستوں کی طرح بغل گیر ہوئے۔ پھر بچن سنگھ کا ہات جلدی سے اس کی جیب میں چلا گیا اور بڈھے کا ہات پتلون کے باہر ہی رہا۔ جلدی سے بچن سنگھ نے گاڑی میں بیٹھ کر اُسے اسٹارٹ کیا اور کھوداگلی سے ورشن لین اور پھر کیڈل روڈ پر ہو کر سری تواس سے شیواجی پارک کے چوک میں آگیا۔ دس منٹ کا راستہ تھا جو اس نے غالباً دو منٹ میں طے کیا ہوگا۔

اس کے بعد وہ مجھ سے بولا کبھی کبھی سچ بولنے سے بڑا فائدہ ہو جاتا ہے۔ وہ سپاہی میرے سچ کو جھوٹ سمجھا۔ اور غچا کھا گیا۔ ہا ہا ہا۔ کدھر سے لے چلوں؟ خداداد سرکل سے یا پورچو گیز چرچ سے؟" پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولا۔ اُدھر دادر سے جے جے ہسپتال تک بڑی گردی رہتی ہے۔ اس لئے پورچو گیز چرچ سے چلتا ہوں راستہ بھی کھُلا ہے گا اور ——"

میں نے اُسے ٹوک کر ذرا سختی سے کہا۔ "جدھر راستہ کھلا ہے اُدھر سے چلو مگر احتیاط سے چلو!"

"احتیاط تو لازم ہے!" بچن سنگھ بڑی سنجیدگی سے بولا، اور ٹیکسی تو میں ایسی احتیاط سے چلاتا ہوں کہ دوسرے ڈرائیور میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ بولتے ہیں بچن تو تو بالکل چوہے کی طرح ڈرپوک ہے!"

میں نے دل میں سوچا اگر یہ ڈرائیور چوہا ہے تو شیروں کی رفتار کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔ مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ بچن سنگھ ذرا سنجیدہ ہو کر چالیس کی رفتار سے ٹیکسی چلاتا رہا۔

اتفاق سے اُسے راستے میں کوئی موٹر گاڑی یا لاری بھی نہیں ملی جسے وہ اوور ٹیک کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے اپنے دونوں ہات، چند لمحوں کے لئے سٹیرنگ وہیل سے اُٹھا لئے اور سامنے کے آئینے کو ترچھا کرکے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پگڑی ٹھیک کرنے لگا۔ سامنے سے ایک بڑا ٹرک چلا آرہا تھا۔ قریب آرہا تھا۔ قریب آگیا۔ بالکل قریب آگیا۔

یکایک میں نے چیخ کر کہا۔ "ارے کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟"

بچن سنگھ نے بڑی پھرتی سے وہیل گھمایا۔ ٹرک ایک فٹ کے فاصلے سے دہاڑتا ہوا گزر گیا۔ اور ساری زمین کانپ اُٹھی۔ میرے سارے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور اپنے چہرے کو صاف کرنے لگا۔

بچن سنگھ ہنس کر بولا (اور اُس کی آواز میں تھوڑی سی حقارت بھی تھی) "بابو جی، آج مرنا کل مرنا، پھر مرنے سے کیا ڈرنا؟ اگر آئی ہوگی تو گھر پر بیٹھے بیٹھے مر جاؤ گے۔ نہیں تو یہ ٹیکسی تو کیا پہاڑ سے کُود پڑو گے تو بھی بچ جاؤ گے"۔ بچن سنگھ نے یہ کہہ کر گاڑی کی رفتار ساٹھ میل کر دی اور لہک لہک کر گانے لگا۔

"بنتو دا لک پتلا"!

میں نے دل میں سوچا صرف بنتو کی کمر ہی پتلی نہیں ہے۔ اپنی قسمت بھی بالکل پتلی بلکہ نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتی ہے۔ کسی طرح سے اس ٹیکسی ڈرائیور سے جان بچ جائے تو سائیں بابا کے قدموں میں گیارہ روپے کا چڑھاوا چڑھاؤں گا۔

یکایک بچن سنگھ نے گاڑی کی رفتار اکدم ہلکی کر دی۔ حیرت کا ایک دوسرا جھٹکا مجھے لگا۔ وہ میری طرف مڑ کر بولا۔ "آپ نے دیکھا؟"

"کیا؟"

"وہ اولڈ موبائل جو پیچھے رہ گئی۔ اُس میں؟"

"کیا تھا؟"

"تھا نہیں۔ تھی۔"

"کیا تھی؟" میں نے بالکل غبی بن کر پوچھا۔ ویسے بھی جھٹکے کھاتے کھاتے میرے ذہن میں موت کے سوا اور کسی شے کا تصوّر باقی نہیں رہ گیا تھا۔

"لڑکی" بچن سنگھ نے مجھے آنکھ مار کے کہا۔ "دیکھیے۔ وہ اب مجھے اوورٹیک کرے گی۔ غور سے دیکھیے۔"

میں نے غور سے دیکھا۔ ایک لڑکی تھی۔ ایک گاڑی تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے۔

"عمدہ مال ہے،" بچن سنگھ نے چٹخارہ بھرتے ہوئے کہا۔ "نئے ماڈل کی شیورلٹ معلوم ہوتی ہے۔"

"تم گاڑی کے بارے میں بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو لڑکی کے بارے میں بولتا ہوں۔" بچن سنگھ نے قہقہہ مار کے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ نے غور سے نہیں دیکھا۔ لیجیے میں پھر آپ کو دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ گاڑی کو ریس کر کے پھر آگے لے گیا۔

اب اُس کی گاڑی لڑکی کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ لڑکی نے ایک لمحے کے لیے سامنے سے نگاہ اُٹھا کر ہماری طرف اس نخوت سے دیکھا جیسے کوئی اعلیٰ نسل کی پومرین گھٹیا گلی کے کتوں کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر اُس کی گاڑی

آگے نکل گئی۔

"ہے نا فرسٹ کلاس؟" بچن سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔

"اکدم ہائی کلاس؟" میں نے اُس کی تائید کی۔

"اُس کے پیچھے پیچھے چلیں؟" بچن سنگھ نے مجھے مشورہ دیا۔

"ارے نہیں بھائی" میں نے گھبرا کر کہا۔ "مجھے تو ابھی سمال کوز کورٹ پہنچنا ہے۔ ورنہ مالک مکان قرقی کرالے گا۔"

بچن سنگھ نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "ابھی تو کورٹ کھلنے میں چالیس منٹ ہیں، جب تک تو ہم اس لڑکی کا گھر معلوم کر کے واپس بوری بندر پہنچ سکتے ہیں۔ ہمت کر کر جاؤ بابُو۔"

"ارے نہیں بھائی۔ تم سیدھے چلو اس وقت۔" میں نے بالکل زچ ہو کر کہا۔ تمہیں لڑکی کی پڑی ہے، یہاں جان پر بنی ہے۔ اور دیکھو گاڑی آہستہ چلاؤ۔ بالکل آہستہ" میں نے کڑے لہجے میں کہا۔ چاہے عدالت میں پانچ دس منٹ دیر سے پہنچیں گے۔ مگر پہنچ تو جائیں گے۔"

بچن سنگھ کو میری بزدلی پر بے حد قلق ہوا۔ آہستہ سے سر ہلا کر بڑے افسوس سے بولا۔ "تمہاری مرضی سیٹھ! ورنہ ایسی لڑکی بمبئی میں تو اب کبھی نہیں ملے گی۔ میری ٹیکسی لے کر دس دن ڈھونڈو گے تو بھی نہیں ملے گی۔ کیا سٹریم لائن باڈی ہے اُس کا! کیا پالش ہے!"

"مجھے کسی لڑکی کا پیچھا نہیں کرنا ہے۔ بچن سنگھ!" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "کسی طرح تم مجھے وقت پر سمال کوز کورٹ پہنچا دو تو میں تمہیں دو روپے انعام دوں گا۔ ورنہ ٹیکسی

روک لو اور مجھے یہیں چھوڑ دو۔"

"صاحب آپ کا نمک کھایا ہے کتنی بار۔ ایسے کیسے چھوڑ دے گا۔ آپ کو؟" بچن سنگھ نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ "آپکو سمال کوز کورٹ اور پھر کورٹ سے گھر چھوڑ کے آئے گا بھانڈوپ میں۔"

"میں بھانڈوپ میں نہیں رہتا۔ میں بھانڈوپ میں نہیں رہتا۔ میری سات پشتوں میں سے آج تک کوئی بھی بھانڈوپ میں نہیں رہا۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

بچن سنگھ نے اکدم میری طرف سے مُنہ موڑ لیا اور گاڑی کی رفتار تیز کر کے لڑکی کی گاڑی سے آگے نکل گیا اور بائی کلا کی طرف جاتے ہوئے اس نے درجنوں گاڑیں لاریوں۔ ٹرکوں کو گرد کی طرح پیچھے چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ بھی اُس نے مُڑ کر مجھ سے بات نہیں کی اب وہ یقیناً مجھ سے خفا تھا اور میں اس سے بائی کلا کے قریب پہنچ کر میں نے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف نگاہ دوڑائی۔ مگر مجھے وہاں ٹیکسی نظر نہ آئی۔ ورنہ میں فوراً اُتر کر دوسری ٹیکسی لے لیتا۔ بد قسمتی سے صبح کا وقت تھا۔ گویا دفتروں اور کارخانوں اور عدالتوں میں جانے کا وقت تھا۔ ایسے موقع پر دوسری ٹیکسی کہاں سے ملے گی، میں مایوس ہو کر اسی ٹیکسی کے اندر جلتا بُھنتا ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

بائی کلا کے چوک پر بُری بھیڑ تھی۔ ہماری ٹیکسی کے آگے گاڑیوں، لاریوں کا ایک اژدہام تھا۔ ایک طرف ٹرام کا پڑا تھا دوسری طرف بسوں کی ایک لمبی قطار تھی بیچ میں راستے کی ایک پتلی سی سُرنگ بن گئی تھی۔ اتنی پتلی کہ اُس میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی ٹیکسی کا گزرنا بھی مشکل تھا۔ چند منٹ تک تو بچن سنگھ آگے والی ٹیکسیوں اور گاڑیوں کو ہارن پر ہارن دیتا رہا اور اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کسمساتا رہا۔ پھر اُس نے

ایکدم بڑی پھرتی اور مشاقی سے گاڑی ذرا گھما کر اور لائن سے باہر نکل کے سُرنگ کے اندر ڈال دی۔

میرے دونوں طرف، دائیں بائیں ریوز راڈ ٹرامیں اور بسیں خوفناک انداز میں گھڑگھڑاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اس سُرنگ میں ہماری ٹیکسی ایک چھوٹی سی چیونٹی کی طرح بھاگتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک طرف ٹرام سے اور دوسری طرف بس سے بچ کر بھاگتے ہوئے ایسا لگتا تھا۔ جیسے میری ٹیکسی میں اور ٹرام یا بس میں صرف چھ انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ صرف چار انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ کوئی فاصلہ نہیں رہ گیا ہے۔ اب ایکسی ڈینیٹ ہو گا۔ اب ایکسی ڈینیٹ ہو گا۔ خوف اور دہشت سے میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے اور سارے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

یکایک بچن سنگھ ایک وحشیانہ خوشی سے چلّایا۔ وہ اُس تنگ سی سُرنگ سے اپنی ٹیکسی کو ثابت و سالم نکال کے لے آیا تھا اور ساری بسوں ٹراموں اور ٹیکسیوں اور لاریوں سے آگے نکلتا ہوا اپنی ٹیکسی کو جے جے ہسپتال کی طرف بھگاتا ہوا لے جا رہا تھا۔

"دیکھا آپ نے؟" بچّن سنگھ اپنی ساری خفگی بھول گیا اور فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ "دیکھا آپ نے؟"

میں نے تو دیکھا۔ لیکن اس نے نہیں دیکھا کہ بائیں طرف سے ریلوے انسٹی ٹیوٹ کے اوپر کے پل سے ایک ٹرک بڑے زور سے گھوں گھوں کرتا سانڈ سے چلا آ رہا ہے۔ میں نے چلا کر کہا۔

"بریک لگاؤ۔ بریک لگاؤ—!" اور خوف سے اپنی آنکھیں بند

کر لیں ——!

٭ ٭ ٭

جب میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ لوگ مجھے ایک سٹریچر پر لٹا کر ہسپتال کے اندر لے جا رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ دوسرے سٹریچر پر بچن سنگھ شدید زخمی حالت میں پڑا تھا۔ جگہ جگہ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر بولا: "بابو تیری غلطی سے ایکسیڈینٹ ہو گیا۔ اگر میں بریک نہ لگاتا تو صاف اپنی ٹیکسی کو لاری سے پہلے بھگا کر لے گیا ہوتا" —— پھر ہسپتال کے اردلیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "دیکھتے کیا ہو؟ تیز تیز چلو۔ دیکھتے نہیں ہو بابو کا سٹریچر ہم کو اوورٹیک کر رہا ہے؟"

ہارٹ اٹیک

آج منوہر کی بار میں کوئی ہنگامہ نہ تھا۔ لمبے کونٹر کے گرد نیم دائرے کی شکل میں بچھے ہوئے بارہ گدّے دار اسٹولوں پر منوہر کے بارہ قریبی دوست سر جھکائے خاموشی سے شراب یوں پی رہے تھے۔ جیسے جلاب کی کوئی دوا پی رہے ہوں، کچھ ایسا کرب ان کے چہروں پر طاری تھا، کونٹر سے پرے ہال کی میزوں پر بھی یہی سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ اندر آتے ہی میں کچھ لمحوں کے لئے جھجکا —— خاموشی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ منوہر کی بار دِلّی کی سب سے بارونق بار سمجھی جاتی تھی۔ جھگڑا کبھی نہ ہوتا، لیکن ہنگامہ ہر لمحہ ہوتا تھا۔ یہاں شہر کے دانشور آتے تھے۔ شاعر اور ادیب، فلسفی اور موسیقار، پڑھے لکھے بزنس مین اور عمدہ لباس پہننے والے کہنہ مشق اوباش، اور کہیں کہیں کوئی زیرِ لب مسکراتا ہوا سرکاری افسر، اپنی افسری پر پشیمان اور شرمندہ۔ منوہر کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اور منوہر کی بار میں زیادہ تر منوہر کے دوست ہی آتے تھے۔ ہر شام

آجاتے تھے۔ گیارہ بجے تک محفل جمی رہتی۔ ہنسی مذاق، شعر و شاعری، چست جملے بازی، کہیں کہیں تھوڑا سا پھکڑ پن بھی۔ گیارہ بجے منوہر اپنی بار بند کر دیتا۔ اور پھر اپنے چند بہت قریبی دوستوں کو لے کر اپالو ہوٹل کے لان میں چلا جاتا۔ گیارہ سے بارہ بجے تک ایک دور وہاں چلتا۔ کیونکہ اپالو ہوٹل والے بارہ بجے تک ڈرنک دیتے تھے۔ اپالو ہوٹل کی لان میں پینے کا مزہ ہی کچھ اور تھا کھلے لان میں، کھلے آسمان تلے، املی کے پیڑ کے نیچے معلوم ہوتا تھا شراب نہیں پی رہے ہیں۔ چاندنی پی رہے ہیں۔ تاروں کی نگاہیں پی رہے ہیں۔ رات کے سناٹے میں یاد آنے والے خوش جمالوں کا تصور پی رہے ہیں۔ اب ہر شخص اکیلا ہے۔ اپنی اپنی یادوں میں کھویا ہوا۔ دھیرے دھیرے، دھیمے دھیمے قدموں سے سرک کر رات ہر شخص کے قریب آجاتی ہے اور اس سے لپٹ کر محبت کرنے والی عورت کی طرح سسکتی ہے۔ اب جام میں شراب نہیں ہے۔ صرف آنسو ہیں۔ بارہ بجے کے قریب منوہر اس سناٹے کو توڑ دیتا۔ اور بلند آواز میں کہتا ——

"چلو یارو۔ جی ٹی روڈ چلیں۔"

جی ٹی، روڈ کی گانے والیاں گویا بارہ بجے ہی سے منوہر کی ٹولی کے انتظار میں ہوتیں۔ چار پانچ موٹروں میں لد کر منوہر کے پندرہ بیس یار منوہر کی رہنمائی میں باری باری سب اچھے گانے والیوں کے در پر دستک دیتے۔ ہر جگہ آدھ گھنٹہ پون گھنٹہ بیٹھ کر گانا سنتے تین بجے کے قریب جب منوہر اور اس کے دوستوں کی جیبیں خالی ہو جاتیں تو منوہر کو جماہی آنے لگتی۔

"چلو یارو گھر چلیں۔"

عجب دلچسپ آوارگی بے فکری، اور خوش گپیوں کے دن تھے۔ ان دنوں

یاروں کو صرف ایک ہی غم تھا۔ دن کیوں چڑھتا ہے؟ رات کیوں اتنی جلدی ختم ہو جاتی ہے؟

اس لیے آج میں منوہر کی بار کا سناٹا دیکھ کر چونک گیا۔ کونٹر پر خلافِ معمول آج منوہر بھی غائب تھا۔ میں اور چونکتا ہوا۔ آگے بڑھا۔ ایک ڈبل وسکی کا آرڈر دے کر، ہول سیل گھڑیاں بیچنے والے گنجے رتن لال کے سر پر دو ہاتھ مار کر بولا "کیوں بے گنجے آج چُپ چُپ کیوں"؟

رتن لال کو ایک مرض تھا۔ جب تک اس کے گنجے سر پر دو تین کرارے ہاتھ نہ پڑیں اُسے نشہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ نشہ لانے کے لیے منوہر نے اپنے کونٹر کی دراز میں پلائی وُڈ کی ایک چپٹی سی تختی رکھی ہوئی تھی جسے وہ بانس کی طرح رتن لال کے سر پر مارتا تھا۔ سر پر مارتے ہی پٹاخے کی سی آواز پیدا ہوتی۔ اور رتن لال کی گردن تن جاتی۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتیں اور وہ اپنی گول گول آنکھیں مٹکاتے ہوئے خوش ہو کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا۔

"یار منوہر ایک پٹی اور مار۔ نشہ دگنا ہو جائے۔"

مگر آج میرے ہاتھ مارنے سے رتن لال رتی بھر خوش نہ ہوا۔ اُلٹا خفا ہو کر میری طرف یوں دیکھنے لگا، جیسے میں نے اس کی ہتک کر دی ہو۔

میں گھبرا کر جوہری کی طرف مڑا۔ جوہری فلیش مین ہوٹل میں بدیسی سیاحوں کے ہاتھوں، ہندوستانی زیورات آٹھ گنی قیمت پر بیچتا تھا۔ ایک رنڈی اس کی میرٹھ میں تھی۔ دوسری جی ٹی روڈ پر۔ ایک بیوی گھر پر تھی۔ مگر شکل و صورت سے ایسا شرمیلا اور کنوارا لگتا تھا۔ گویا آج تک اس نے کسی عورت کی صورت نہ دیکھی ہو۔

"جوہری، آج بار کو کیا ہوا ہے ؟" میں نے اُس سے پُوچھا۔

جوہری نے چونک کر چُپ چاپ میری طرف دیکھا۔ پھر اپنی نگاہیں پھیر کر اپنے جام میں ڈبو دیں۔ کچھ نہیں بولا

تو میں نے چیت رام کا شانہ جھنجھوڑا، جو ملک کی فارن ایکسچینج کی دِقّت کو دُور کرنے کے لئے ڈالر کے جعلی نوٹ چھاپتا تھا "کچھ منہ سے پھوٹو گے کہ نہیں ؟" اور چیت رام نے ہاتھ کے جھٹکے سے اپنا شانہ میرے ہاتھ سے الگ کیا اور خفا ہو کر بولا:

"منوہر کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے ——!"

❖ ❖ ❖ ❖

میں سکتے میں آ گیا۔ منوہر کو ہارٹ اٹیک ؟ چھ فٹ کے اُونچے لمبے تڑنگے، مضبوط جوان کو ہارٹ اٹیک —— ؟ وہ آدمی جو ہر وقت ہنستا کھیلتا رہتا تھا۔ جس کے اندر زندگی کی قوت بجلی کے ایک طاقتور جنریٹر کی طرح دوڑتی رہتی تھی۔ جس کا دل ایک گھوڑے کی طرح مضبوط تھا۔ اُسے ہارٹ اٹیک کیسے ہو سکتا ہے —— ؟ میرا دماغ گھومنے لگا۔ میں نے جلدی سے جام اپنے منہ سے لگایا اور خالی کر دیا۔

❖ ❖ ❖ ❖

منوہر چار دن ہسپتال میں آکسیجن پر رہا۔ پھر ہولے ہولے سنبھلنے لگا۔ تین ماہ بعد اس قابل ہو گیا کہ اپنے بستر سے اُٹھ کر کمرے میں چار قدم چل سکے۔ چھ ماہ بعد اپنے معمول پر آ گیا۔ پھر وہی بار کے ہنگامے، اپالو ہوٹل کی بیٹھکیں، جی ڈی روڈ کی محفلیں، وہی چھپے، وہی خوش گپیاں، اور چہلیں۔ بار کی بہار واپس آ گئی اور کچھ زیادہ شدت کے ساتھ۔ رنگینیاں بڑھ گئیں۔ محفلیں لمبی ہوتی گئیں۔ منوہر کے قہقہے اونچے ہوتے گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ

کھلنڈرا اور شریر ہوگیا۔

ایک دن اس کے بڑے بھائی گجندر نے مجھے بلایا اور اکیلے کمرے میں لے جاکے کہنے لگا۔

"تم منوہر کے بہت قریب ہو، تم اُسے سمجھاؤ، وہ اپنی آوارگی چھوڑ دے۔"

"کیا کرتا ہے وہ"—؟ میں نے کہا۔ "گاتا ہی تو سنتا ہے۔"

"نہیں تم نہیں جانتے۔ ڈاکٹر نے بڑی سختی سے منع کیا ہے۔ وہ سگریٹ نہ پیئے، شراب نہ پیئے۔ رات کو دس بجے کے بعد نہ جاگے۔ مگر وہ میری ایک نہیں سنتا۔ پہلے سے زیادہ ہنگامے کرتا ہے۔ اپنی صحت کا ذرا خیال نہیں کرتا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو اس کی صحت پہلے سے اچھی دکھائی دیتی ہے۔ اس قدر چست اور چاق و چوبند دکھائی دیتا ہے کہ اُسے دیکھ کر جی چاہتا ہے مجھے بھی ایک ایسا ہارٹ اٹیک ہو جائے۔"

گجندر نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "تم نہیں جانتے اصل معاملہ کیا ہے۔"

"کیا ہے——؟" میں نے پوچھا۔

گجندر دیر تک خاموشی سے اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا اور ہاتھ ملتا رہا۔ پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ "اُسے ایک لڑکی سے محبت ہے۔"

"کسے؟ منوہر کو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ہا ہا ہا۔" میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ "محبت اور منوہر؟" میں پھر ہنسنے لگا۔

"مذاق مت کرو یہ سچ ہے! اور جس دن اُسے ہارٹ اٹیک ہُوا اُسی دن اُس لڑکی کی شادی ہوئی تھی۔"

دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ میں حیرت سے، اور وہ کسی آنے والے حادثے کے خوف سے۔ پھر اُس نے بڑی مایوسی سے اپنے دونوں ہات ملے اور مجھ سے کہا —

"وہ اپنے آپکو ختم کئے ڈالتا ہے۔ اسے سمجھاؤ کسی طرح۔ تم اُس کے دوست ہو —!"

ایک دن میں نے منوہر کو دن میں اس کی کیبن میں پکڑ لیا۔

"یہ رجنی کون ہے؟"

وہ دیر تک آنکھیں جھپکتا رہا۔ پھر بولا "تمہیں گجندر نے بتایا ہوگا —؟"

"ہاں"

"بھائی صاحب کو محض وہم ہے۔ میں کسی لڑکی کی محبت کے چکر وکر میں نہیں پڑا آج تک!" وہ ذرا غصے سے بولا۔

"پھر تمہیں اُسی دن ہارٹ اٹیک کیوں ہوا جس دن تم نے رجنی کی شادی کی خبر سُنی؟"

"محض اتفاق ہے۔" وہ کرسی سے اُٹھ کر بولا۔ اور پیچھے مڑ کر کانچ کی الماری سے جن کی ایک بوتل اور دو گلاس اُٹھا لایا۔ "ایک ایک گمبلٹ ہو جائے۔"

"نہیں!" میں نے بڑی سختی سے منع کیا۔ "تمہارے لئے شراب زہر ہے۔ تم آج کے بعد شراب نہیں پیو گے!!"

"اچھا؟" وہ بڑی نرمی سے بولا۔

"اور سگریٹ بھی نہیں پیو گے!"

"اچھا؟" وہ شہد بھرے لہجے میں بولا۔

"اور رات کے دس بجے سو جایا کرو گے!"

"اچھا؟"

"اور جی ٹی روڈ کبھی نہیں جاؤ گے!"

"تو یوں کیوں نہیں کہتا کہ میں سیدھا بردوار چلا جاؤں۔ سالے!" اُس نے بڑے زور سے میرے شانے پر ایک دھپ مارا۔ اور گلاس میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ "پی گملٹ! اور بھول جا محبّت وحبّت کی بکواس!"

دو گملٹ کے بعد میں نے اُس سے پوچھا "کیا رجنی بہت خوبصورت ہے؟"

وہ بولا "بس ایسی ہی خوب صُورت ہے۔ جیسی اکثر خوب صُورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

"پھر کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"اُس کی ایک ادا مجھے بہت پسند ہے" وہ بولا۔ "کبھی کبھی وہ ایڑیاں اُٹھا کے جب اِدھر اُدھر حیران نگاہوں سے دیکھتی ہوئی چلتی ہے تو اس ادا سے دُنیا کی کوئی خوب صُورت عورت نہیں چلتی۔ وہ ادا میرے دل پر نقش ہے!" —— اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"بس اس ایک ادا پر مر مٹے؟ اُلّو!"

وہ چُپ رہا۔ ہولے ہولے مُسکراتا رہا۔ میری نگاہوں سے پرے۔ جیسے کسی کو

ہوا میں ایڑیاں اُٹھائے چلتا دیکھ رہا ہو۔

"دھنی کو کب سے جانتے ہو؟"

"بچپن سے!"

"پھر اُس سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے ماں باپ نہیں مانے۔ بولے تم اروڑے ہو جات کے۔ ہم کھتری ہیں جات کے۔ اس لئے میری اس کی شادی نہیں ہو سکی۔"

"تو اُٹھا لاتے اُسے ہمالے!" میں نے غصّے سے کہا۔ "تم جو اپنے دوسرے دوستوں کے لئے اُٹھا لاتے ہو! اپنے لئے نہیں لا سکتے تھے؟"

"آدمی جس سے شادی کرنا چاہتا ہے، اُسے اُٹھا نہیں سکتا" — وہ بہت دھیرے سے بولا اور۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ہوا میں سسکی سی سُنی! — میں بہت دیر تک چُپ رہا — پھر میں نے اُس سے پوچھا۔

"اُس سے کبھی بات کی؟" — "موقع ہی نہیں ملا"

"موقع ہی نہیں ملا؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔

وہ کسی قدر شرمندہ ہو کر بولا: "موقعے تو بہت سے ملے، مگر کچھ مجھ سے کہا ہی نہیں گیا۔" وہ چھ فٹ کا احمق لکنت آمیز لہجے میں بولا — "شادی سے چند روز پہلے وہ میری بار میں آئی تھی۔"

"اِس بار میں! یہاں؟"

"ہاں۔ میں کونٹر پر دن بھر کی آمدنی گن رہا تھا۔ کونٹر پر نوٹوں اور سکوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ چونیاں، اٹھنیاں، رُوپے — ڈھیر لگا ہوا تھا کہ میں نے اُسے یکایک

بالکل اپنے قریب کونٹر پر کھڑا دیکھا۔ اُس نے کیسری رنگ کی چُست قمیض پہن رکھی تھی اور گلابی شلوار۔ اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھی ——— "مجھے دس روپے کا چینج چاہیئے۔!" اور اُس وقت میرے قریب کوئی نہ تھا ———"

"پھر تم نے کیا کہا؟" میں بولا

"میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔"

"گدھے!"

"وہ پھر بولی۔ مجھے دس رُوپے کا چینج چاہیئے ———" میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میری زبان تالو سے لگ گئی۔ اور میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں اور میں کچھ نہیں بول سکا۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ میں نے کانپتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں، چونیاں، اٹھنیاں اور دوپوں کے سِکّے بھرے، اور بھری ہوئی مُٹھی اُس کے سامنے لے جا کر کھول دی۔ اُس نے خاموشی سے میرے ہاتھوں سے دس رُوپے کا چینج اُٹھا لیا۔ بار بار اُس کی اُنگلیاں میرے ہاتھوں سے مَس ہوتی رہیں جیسے وہ اُنگلیاں ہولے ہولے میرے دل پر دستک دے رہی ہوں۔"

"پھر؟" میں نے پُوچھا۔

"پھر وہ بڑے اطمینان سے اُس ریزگاری کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر گننے لگی۔ اور میں ایک گونگے بھکاری کی طرح اُس کے پاس کھڑا رہا۔ جیسے یہ کوئی بہت بڑی رسم تھی۔ جو کچھ میرے پاس تھا، میں نے اُسے دے دیا تھا۔ اور اس میں سے جتنا وہ لے سکتی تھی۔ اُس نے لیا تھا۔ اور اب کسی کو کسی سے کچھ کہنا نہ تھا۔ جیسے میرا اور اُس کا اتنا ہی ناطہ تھا۔ اس لیے اس نے خاموشی سے چینج گن لیا اور اُسے اپنے بٹوے میں رکھ کر اُس

نے ایڑیاں اُٹھا کر چاروں طرف بڑی حسرت سے دیکھا۔ جیسے دیواروں سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو، اور جب اُسے چاروں طرف خاموشی کے سوائے کچھ نہ ملا، تو وہ چلی گئی۔"

میں دیر تک اپنے گملٹ کے نازک گلاس کی ڈنڈی کو اپنی انگلیوں میں گھماتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا، اُس سے کیا کہوں — ؟

"تم بھی کہیں شادی کر لو" — آخر کار میں نے اُسے مشورہ دیا — مگر دوسرے لمحے ہی مجھے اپنا مشورہ بڑا بے کار معلوم ہوا۔ کچھ ایسا لگا، جیسے میں اُس سے کہہ رہا ہوں — تم بھی کہیں شادی کر لو — یعنی — تم بھی ریڈ گاری گھالو۔ نیا جوتا خرید ڈالو — شمشان گھاٹ چلے جاؤ — میں خود ہی کہہ کے بہت شرمندہ ہوا۔ اور خاموشی سے اُٹھ کر چلا آیا۔

❖ ❖ ❖

چار سال کے بعد منوہر کو پھر ہارٹ اٹیک ہوا۔ میں اُن دنوں یورپ میں تھا۔ اب کا حملہ پہلے سے بھی سخت تھا۔ مگر منوہر بھی بے حد سخت جان تھا۔ وہ یہ اٹیک بھی برداشت کر گیا اور گیارہ ماہ بعد جب میں یورپ کے سفر سے لوٹا تو اُسے ہشاش بشاش کونٹر پر کھڑے پایا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے جُوں کا توں، ٹھیک چُست اور چاق و چوبند لگا۔ مگر بہت قریب جا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اُس کے چہرے کی جلد بوڑھی ہو چکی ہے۔ اور جب وہ چلتا ہے تو اُس کا دائیاں پاؤں ذرا مشکل سے اُٹھتا ہے، قریب جا کر وہ ایک ایسے بھاری بھرکم تناور درخت کی طرح معلوم ہوا۔ جو زندہ تو ہے لیکن جس پر بجلی گر چکی ہے۔

مجھے اُس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ مگر اس وقت میں چُپ رہا —

رات کو جب ہم لوگ اکیلے بیٹھے تو میں نے پوچھا۔

"اب کے کون تھی ـــــ؟ دوسرے ہارٹ اٹیک والی ـــــ؟" میں نے براہ راست سوال کیا تھا۔ وہ ایک دم چونک گیا، مجھے سنجیدہ اور گمبھیر دیکھ کر ـــــ وہ بھی بھڑکنے کے بجائے سنجیدہ ہو گیا۔ اور جب اس نے اپنا سر ذرا سا موڑا تو مجھے اُس کی کالی کنپٹیوں میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے چند سفید بال نظر آئے۔

"ایک رنڈی تھی جی ٹی روڈ والی۔" وہ مسکرانے لگا۔

"رنڈی؟" میں نے حیرت سے تقریباً چیخ کر کہا۔

"ہاں ہاں رنڈی!" وہ بھی میرے سوال کے لہجے سے بھنّا کر بولا ـــــ "تو کیا محبت کسی کی جنم پتری دیکھ کر کی جاتی ہے ـــــ؟ ـــــ یا شاید شجرۂ نسب؟ ـــــ"

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ مگر ـــــ" میں ذرا نرم پڑنے لگا۔

"مگر کیا؟" وہ جھلّا کر بولا۔

"کچھ نہیں۔ تم آگے کہو۔"

"آگے کہنے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ارے ـــــ! تو کیا تم یہاں بھی گونگے رہے؟"

"نہیں۔ میں نے تو کہا۔ اور بار بار کہا مگر وہ نہیں مانی۔"

"وہ رنڈی نہیں مانی؟" میرے مُنہ سے پھر حیرت کی چیخ سی نکل گئی۔

"تم بار بار رنڈی کیسے کہتے ہو؟" وہ بھی غصّے میں بلند آواز سے بولنے لگا ـــــ

"آل رائٹ! میں جو شراب بلیک میں بیچتا ہوں، یہ رنڈی پنا نہیں ہے کیا؟

تم جو امپورٹ ایکسپورٹ کے دھندے میں انڈر انوائیسنگ UNDER-INVOICING

کرتے ہو۔ یہ حرامی پنا نہیں ہے کیا ـــــ؟ وہ ہوٹل والا جو گورنمنٹ سے پینتالیس لاکھ لے کے پینتیس لاکھ میں ہوٹل بناتا ہے، وہ کیا طوائفیت میں شامل نہ ہوگا؟ وہ نیتا جو ایلکشن کے موقع پر لمبے چوڑے وعدے کر کے مُکر جاتا ہے۔ کسی رنڈی سے بہتر ہے۔ مسٹر؟ ـــ یہاں کون ہے جس کی رُوح رنڈی نہیں ہے؟ ـــــ"

"اسے رے رے۔ تم تو خفا ہو گئے مجھے معاف کردو پیارے۔ یونہی میرے مُنہ سے نکل گیا تھا۔"

میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے ٹھنڈا کیا۔ جب اُس کا غصّہ اُترا تو میں نے اُس سے پُوچھا۔

"مگر وہ مانی کیوں نہیں؟"

"احمق تھی۔ ہر بار یہی کہتی تھی۔ میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ میں گندی ہوں میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"تو کیا تم اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟" مجھے پھر غصّہ آنے لگا۔ واقعی جو کسی نے کہا ہے کہ لمبے آدمی بڑے احمق ہوتے ہیں تو یہ بالکل سچ ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا۔

"جی ہاں میں منوہر داس ولد شیام داس سکنہ کشمیری گیٹ اُسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہیں مانی۔ لیکن میں برابر اصرار کرتا رہا۔ تو وہ جی ٹی روڈ چھوڑ کر لکھنؤ چلی گئی۔ جب میں نے لکھنؤ تک اُس کا پیچھا کیا تو وہ لکھنؤ چھوڑ کر اپنے آبائی وطن فیروز آباد چلی گئی۔ میں فیروز آباد گیا اور اُس کے گھر سات دن رہا، اور

سات دن اس کی خوشامد کرتا رہا مگر وہ نہیں مانی۔"

"آخر کیوں نہیں مانی؟"

"کہنے لگی۔ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ کیوں کہ مجھے تم سے محبّت ہے۔"

"عجیب دلیل ہے!"

ہاں ہے تو سہی۔ مگر اس کے اپنے خیال کے مطابق اس میں بڑا وزن تھا۔ بہر حال میں بھی ڈٹا رہا، آخر وہ مان گئی — بولی "اچھا میں اپنا دھندا بند کئے دیتی ہوں۔ میرے پاس اتنا ہے کہ دو زندگیاں بھی بیٹھ کے کھاؤں تو میرے گذارے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے میں اپنا دھندا بند کئے دیتی ہوں۔ اور چھ ماہ تک اسی فیروز آباد میں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی۔ اگر چھ ماہ کے بعد تم پھر میرے پاس آؤ گے اور مجھ سے شادی کی درخواست کروگے تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔ مگر یہ شرط ہے کہ چھ مہینے تک تم میری صورت نہ دیکھو۔ میں مان گیا۔ اور چھ مہینے تک میں فیروز آباد نہیں گیا۔ چھ مہینے کے بعد جو گیا تو وہ مجھے وہاں نہ ملی۔"

"نہیں ملی —؟"

"نہیں، معلوم ہوا وہ فیروز آباد سے میرے آنے کے دو ماہ بعد چلی گئی تھی اور اب میرٹھ میں دھندا کرتی ہے۔ تو میں میرٹھ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے گانا بجانا بند کر دیا، اور میرے پاؤں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ میں نے پوچھا — جمنا یہ تو نے کیا کیا —؟ تو بولی۔ کیا کرتی؟ جھوٹ بولنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میں تیری زندگی خراب نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے یہاں آگئی۔ اب تو میرے پیٹ میں کسی دوسرے کا بچّہ ہے۔ اب تو میں نے اپنے آپ کو اس درجہ غلیظ

اور گندا کر لیا ہے تاکہ تو کسی طرح مجھ سے شادی کے لئے نہ کہہ سکے۔

* * *

"منوہر میں نے تمہارے ایسا لمبا چوڑا احمق دُنیا میں نہیں دیکھا۔ تمہارے پاس کیا نہیں ہے! دھن دولت، عزت، شکل وصورت، سب کچھ تمہارے پاس ہے۔ تم کسی بھی شریف زادی سے شادی کر کے خوش رہ سکتے ہو۔"

جواب میں منوہر کچھ نہیں بولا۔ کانچ کی الماری سے اُس نے وسکی کی بوتل نکالی اور دو گلاس۔

"میں تمہیں پینے نہیں دوں گا ——" میں نے گلاس اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

اُس نے ایک سگریٹ سلگا لیا۔

میں نے سگریٹ اُس کے ہاتھ سے چھین کر بجھا دیا۔ "یہ مہلک ہے تمہارے لئے۔"

"جینا کون چاہتا ہے؟" وہ گلوگیر لہجے میں بولا

"باؤلے ہوئے ہو؟" میں نے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ "تم جوان ہو اور خوبصورت ہو، اور امیر ہو۔ تمہارے پاس کیا نہیں ہے؟ آج ہی اس شہر میں سینکڑوں ایسی لڑکیاں مل جائیں گی جو تم سے محبت کر کے فخر محسوس کریں گی۔"

"سوال کسی دوسرے کی محبت کا نہیں ہے پیارے۔ صرف اپنی محبت کا ہے۔ جس طرح انسان اپنی محنت سے روٹی کماتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی محنت سے محبت کرتا ہے۔ میں کسی دوسرے کی محبت کا بھوکا نہیں ہوں۔ صرف اپنی محبت

کا بھوکا ہوں۔ اور جس طرح انسان روٹی کے ایک ٹکڑے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اُسی طرح وہ محبت کے ایک ٹکڑے کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور مصیبت یہ ہے کہ اس دُنیا میں انسان گیہوں کی فصل تو بار بار لگا سکتا ہے۔ لیکن محبت کی فصل بار بار نہیں کاٹ سکتا"

اُس نے اپنا سر میز پہ رکھے ہوئے ریزگاری کے ڈھیر میں چھپا لیا اور پھر وہ پھوٹ کر رونے لگا۔ یکایک رات بہت گہری اور گداز ہو کر اس کے کاندھوں پر اُتر آئی۔ اور آس پاس کی دھندلی فضا میں چھپے ہوئے معصوم فرشتے ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اس کی طرف حیرت سے تکنے لگے۔

کاک ٹیل

"ایک کاک ٹیل اور لو !"

* * *

مکّی کے پودے سُوکھ کر سنہرے ہو چکُے تھے۔ لانبے لانبے ٹانڈوں پر لانبے لانبے تیز نکیلے پتّے سُوکھ کر دونوں طرف یُوں جُھک گئے تھے جیسے ہوا کے کسی تیز جھونکے سے کسان کی پگڑی کھل جائے۔ پتّوں اور ٹانڈوں کے اِتصال پر مکّی کے بُھٹّے سنہری فرغل پہنے اپنے سر پر کالے بالوں کی چوٹیاں لہرائے اُن دوشیزاؤں کی طرح بے قرار نظر آتے تھے جو میلے جانے کے لئے بیتاب ہوں۔

یکایک ہوا کے ایک لہراتے ہوئے جھونکے نے جھکے ہوئے خشک پتّوں کو اُٹھا لیا۔ اُنہیں چند لمحوں کے لئے ہوا میں جھنڈیوں کی طرح لہرایا۔ سنہری فرغل کا نپے کالی چوٹیاں ہوا میں لہرائیں اور فضا میں جوان فصل کا قہقہہ گونج گیا۔

یہ قہقہہ چمکیلے جھاگ کے بُلبلوں کی طرح دل سے اُٹھا اور ایک مسکراہٹ کی طرح بدلُو کے چہرے پر کھل گیا۔ وہ فصل سے نگاہ اُٹھا کے ندی کے پار دُور مغرب کے پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اُن پہاڑوں کے اُفق پر کوئی پھول کِھل رہا ہو۔

بُڈھے سانگلُو نے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ اور بول اُٹھا۔ "بہو کو لے آؤ جا کے !"

بدلُو نے پُوچھا۔ "اور فصل کون کاٹے گا ؟"

سانگلو بولا۔ "میں ہوں، تیری ماں ہے، تیرا چھوٹا بھائی ہے۔ تیری دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ اور ہماری فصل ہی کتنی، کِسان کی خوشی کی طرح دو ہی دن میں کٹ جائے گی !"

سانگلُو ایک فلاسفر تھا۔ اس نے بڑے غور سے زمین کو پڑھا تھا اور آسمان کو دیکھا تھا۔ اس لئے وہ فلاسفر ہو چکا تھا۔ (اُس نے حاکم کی تلوار بھی دیکھی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ حاکموں کے نام بدلتے رہتے ہیں لیکن اُن کی تلوار نہیں بدلتی۔ اس لئے اس کا فلسفہ بھی مکّی کے پتوں کی طرح خشک، سُوکھا ہوا اور جذبات سے عاری تھا۔)

"شادی کے بعد مونی اب تک اپنے سسرال نہیں آئی۔ اور اب فصل کٹنے والی ہے۔ اس لئے اسے گھر بُلانے کا یہ سب سے اچھا موقع ہے۔ مونی پہلی بار اپنی سسرال کا گھر دیکھے گی اس لئے اُسے فراغت کے دنوں میں بُلانا اچھا ہے۔ جا کے اُسے لے آ !"

بدلُو کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔ آدمی اس وقت کِھل کِھلا کر ہنستا ہے جب اُس

کے کان وہی سنتے ہیں جو اس کا دل کہتا ہے۔

* * * *

"ایک کاک ٹیل اور لو ——— ڈارلنگ تمہارا نام کیا ہے؟"

* * * *

مغربی پہاڑوں کے مائیکے سے موتی، بدلو کے ہمراہ اپنی سسرال چلی۔ وہ سبز اور پیلے پھولوں والی چھینٹ کی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے، اپنے رخساروں کے گلاب اور آنکھوں کے نرگسی پھول لئے، اپنی جوانی کی ساری خوشبوئیں اپنے دوپٹے میں سمیٹے، بدلو کے ساتھ ساتھ چلی۔

اُس کی ماں نے سفر کے لئے ایک پوٹلی میں مکی کی چار روٹیاں رکھ دی تھیں اور لوکی کا اچار اور پیاز کی دو گٹھیاں اور تھوڑا سا نمک اور چند ہری مرچیں اور بہت سی دُعائیں۔ یہ زادِ راہ لے کر موتی بدلو کے سنگ اپنی سسرال چلی۔

راستے میں موتی نے بدلو سے پوچھا۔ "گھر سے گھراٹ کتنی دُور ہے؟"

بدلو کو ندی کے کنارے اپنے گاؤں کی چھوٹی سی پن چکی کا خیال آیا۔ تنگ کے پیڑوں کی چھاؤں میں کسی خوبصورت صراحی کی طرح ہر وقت قُل قُل کرتی ہوئی پن چکی!

اُس نے کہا "آٹا پیسنے کی چکی ندی کے کنارے ہے۔ ہمارے گھر سے بہت دُور نہیں ہے۔ ایک ڈھکی چڑھ کر اور ایک گھاٹی اُتر کر بس یوں چٹکی بجاتے آدمی آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا ہے۔"

موتی چپ رہی۔ اُسے اپنے گاؤں کے گھراٹ کا خیال آیا۔ بھیڑ کی کھال

میں جب وہ دس سیر اناج بھر کر گھراٹ سے آٹا پسوا کر واپس اپنے گھر آتی تھی تو ڈھلتی چڑھ کر اُس کا سارا بدن تھکی ہوئی گھوڑی کی طرح کانپنے لگتا تھا۔

"مگر میں تمہیں گھراٹ پر جانے نہ دُوں گا"! بدلُو نے موتی کا ہات پکڑ کر نہایت نرم لہجے میں کہا۔ "گھر میں چکی ہے۔"

موتی کا نرم ہات اپنے ہات میں لے کر بدلُو کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کسی نرم و نازک بیل کو ایک مضبوط تنا مل گیا ہو۔ جذبات میں ڈوبتے ہوئے دونوں دیر تک خاموشی سے چلتے رہے۔

پھر موتی نے پوچھا "اور پانی کا چشمہ کتنی دور ہے"؟

پہاڑی گاؤں کی لڑکیوں کو پانی بہت دُور سے لانا پڑتا ہے۔ ایک میل، دو میل، کبھی کبھی تین چار میل کی دُوری پر میٹھے پانی کا چشمہ ملتا ہے۔ راستے لمبے اور دشوار گذار، گھڑے بھاری، پیاس حلق میں کانٹے بچھاتی ہوئی۔ عورتیں آٹھ دس کی ٹولیوں میں چشمے سے پانی بھرنے جاتی ہیں۔ خالی گھڑے لے کر جاتے وقت راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ واپسی پر راستے کے سوا اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ سر پہ تین تین گھڑے رکھ کر جوان عورتیں خچروں کی طرح ہانپنے لگتی ہیں۔

"زیادہ دُور نہیں ہے"۔ بدلُو نے لاپرواہی سے کہا۔ "کوئی ڈھائی تین میل ہوگا"۔

"بالکل اپنے گاؤں کی طرح"۔ موتی نے اپنے دل میں سوچا۔ اور اس کا دل مایوسی سے بیٹھ گیا۔ یہ ہر جگہ پانی گھر سے اتنا دور کیوں ہوتا ہے؟ پھر اُسے اپنی ماں کی کڑی مشقت کا خیال آیا۔ اب تک وہ خود دن میں دو بار، کبھی تین بار چشمے سے پانی لاتی تھی۔ اب گھر بھر کے لئے اُس کی غیر حاضری میں اُس کی بوڑھی ماں کو پانی ڈھونا

پڑے گا۔اپنی ماں کی تکلیف کا خیال کر کے مونی کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔
مگر بدلو نے اُس کے آنسوؤں کا مطلب غلط سمجھا۔ وہ بڑے پیار سے اپنی دلہن کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔"مگر میں تمہیں چشمے پر جانے نہ دوں گا۔ میری دو بہنیں ہیں۔ تمہارے حصّے کا پانی وہ چشمے سے لے آئیں گی"۔
مونی نے غرور بھری نگاہوں سے بدلو کی طرف دیکھا اور چلتے چلتے رُک کر اپنا سر بدلو کے شانے پر رکھ دیا۔

ٹ ٹ ٹ

"بڑا پیارا نام ہے تمہارا۔ ایک دفعہ پیرس میں مجھے اِسی نام کی ایک لڑکی ملی تھی۔ تم پیرس کبھی گئی ہو؟ پیرس کشادہ دلوں اور تنگ کمر والیوں کا شہر ہے۔ لو ایک کاک ٹیل اور ——"

ٹ ٹ ٹ

کھٹّے اناروں کے جنگل میں ٹھنڈا گھنا سایہ تھا۔ اور زمین پر ہری ہری دُوب میں بنفشے کے پھول کِھلے ہوئے تھے۔ اور مونی اور بدلو کو ایک چٹان میں دبکا ہوا ایک خرگوش سفید اُون کے گولے کی طرح سمٹا ہوا نظر آیا اور وہ دونوں اُسے پکڑنے کے لئے بھاگے۔ خرگوش اُنہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے چھلانگ مار کر لپکا اور وہ دونوں اُس کے پیچھے پیچھے، ہنستے ہوئے، ایک دوسرے کا ہات جھُلاتے ہوئے، جنگل کے اندر بھاگے۔ دور تک اندر چلے گئے حتیّٰ کہ خرگوش نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر وہ دونوں بھاگتے بھاگتے رُک گئے اور مونی نے انتہائی مسرور نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا اور بولی۔"ہائے کتنا پیارا

خرگوش تھا۔ میراجی اُسے گود میں لے کر پیار کرنے کو چاہ رہا تھا۔"

"ٹھہر جاؤ" بدلُو نے اُسے شریر نگاہوں سے تاکتے ہوئے کہا۔ "بہت جلد ایسا ہی نرم نرم سفید سفید گول مٹول خرگوش تمہاری گود میں کھیلے گا۔"

موتی کے رخسار انار کی کلیوں کی طرح شرم سے لال ہو گئے۔ اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور وہیں لجا کر ہری ہری دُوب پر بیٹھ گئی اور دوپٹے کا کپڑا اپنے منہ میں داب کر دیر تک یوں ہنستی رہی جیسے کوئی اس کے سارے جسم میں گدگدی کر رہا ہو۔

یکایک بدلُو نے جُھک کر، موتی کو دونوں ہاتھوں سے ایک گٹھڑی کی طرح اُٹھا کر اپنے شانوں پر رکھ لیا اور گاتے ہوئے چلا۔

"دو پتر اناراں دے"

اُس کے شانے پر بیٹھی ہوئی موتی نے اپنی لٹکی ہوئی ٹانگیں ہلا ہلا کر جواب دیا ——

"کھل گئی جندڑی لگ گئے ڈھیر بہاراں دے"

٭ ٭ ٭

"تمہارے ہونٹ کسی اجنبی کا خط معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں کھولنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کاک ٹیل میرے ہات سے پیو۔"

٭ ٭ ٭

رنگ پور کی گھاٹی طے کر کے، ساگرہ کی وادی سے گزر کر، جب وہ کھیڑا گلی کے درّے پر پہنچے، جہاں ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ درّے کی اونچی

چٹانوں کے نیچے سے نکل کر بہتا تھا۔ اور قریب ہیں چیڑھوں کا ایک جھنڈ تھا تو سورج نصف النہار پر آ چکا تھا۔

بدلو نے مونی کو اس چشمے کے کنارے اتار دیا۔ چیڑھ کے سوکھے جھومروں کو پھیلا کر ان پر کھانے کی پوٹلی کھولی۔ اور مونی کے آگے بڑھا دی۔ مونی نے شرما کر پوٹلی بدلو کے آگے سرکا دی تو بدلو نے جھجک کر مکی کی روٹی کا ایک ٹکڑا توڑا۔ اس کے اندر لونکی کے اچار کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے اپنا ہات مونی کے منہ کی جانب بڑھا دیا۔ مونی نے شرما کر اپنا منہ نیچے کر لیا۔ وہ جدھر جدھر اپنا منہ پھیرتی جاتی۔ بدلو کا ہات ادھر ہی ادھر بڑھتا جاتا۔ آخر مونی نے مکی کی روٹی کا وہ ٹکڑا اپنے دانتوں میں داب لیا اور ساتھ میں بدلو کی انگلی بھی۔

"سی!" بدلو نے آہستہ سے کہا۔

گہری خواب ناک نگاہوں سے بدلو کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے مونی نے بدلو کی انگلی چھوڑ دی اور ہولے ہولے مکی کا ٹکڑا کھانے لگی۔ کھاتے کھاتے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مکی کا ٹکڑا نہیں کھا رہی ہے۔ کسی شہد بھرے چھتے کا موم ٹکڑا چبا رہی ہے۔

"وہ سامنے دیکھو میرا گاؤں!" بدلو نے درے کی اونچائی سے نیچے اترتی ہوئی گھاٹیوں کی طرف اشارہ کیا پرے دھان کے کھیتوں سے پرے پہاڑی ڈھلکی پر ایک گاؤں آباد تھا اور اس کے ارد گرد مکی کے کھیت انسان کے حوصلوں کی طرح بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

مونی کا دل دھک سے رہ گیا۔ حیرت اور اچنبھے سے اس کا منہ کھلے کا

کھُلا رہ گیا۔ موقع دیکھ کر بدلو نے اس کے کھُلے مُنہ میں مکی کی روٹی کا دوسرا ٹکڑا ڈال دیا۔

٭ ٭ ٭

یہ چکن چاٹ کھاؤ ڈارلنگ! یہ مُرغ کے سفید گوشت کے باریک ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کا مسالہ ڈالا گیا ہے۔ یہ چکن چاٹ اس ہوٹل کی خاص چیز ہے۔ ذرا چکھ کے تو دیکھو، جب تک میں تمہارے لئے ایک اور کاک ٹیل بناتا ہوں۔

٭ ٭ ٭

گھاٹیاں اُترتے اُترتے جب وہ ندی کے کنارے پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی۔ سُورج کسی لالچی بنیئے کی طرح اپنا سارا سونا سمیٹ کر مغرب میں جا چھُپا تھا۔ راستے کے اندھیرے میں دُور، اُوپر، ڈھلی پر آباد گاؤں میں، کہیں کہیں روشنی کے چراغ جگنوؤں کی طرح چمکتے نظر آتے تھے۔ ہوا میں ایک برفیلی خنکی آ چکی تھی اور موتی رہ رہ کر سردی سے کانپ جاتی تھی۔

بدلو نے اپنی چادر بھی اُتار کر موتی کو اُڑھا دی۔ اور موتی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی دوہری چادر کے اندر نہیں ہے اپنے خاوند کے مضبوط بازوؤں میں ہے۔ ندی پار کرکے دھان کے کھیتوں میں سرسراتی ہوئی باسمتی کے چاولوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں تیرنے لگی۔ ڈھلی چڑھتے چڑھتے اس کے کانوں میں بچوں کی آوازیں آنے لگیں۔ عورتوں کی ہنسی۔ مردوں کی سنجیدہ گفت گو، کہیں بنبلی کا نغمہ۔ کہیں سے ہانڈی میں بھنتے ہوئے سالن کی خوشبو۔ نرم گرم آوازوں اور خوشبوؤں

سے اُس کا دل مہک اُٹھا اور اُس کی بھوک تیز ہو گئی۔

رات کی تاریکی میں کوئی اُنہیں راستے میں نہ ملا۔ ایک گھیل میں سے گذر کر وہ ایک اُونچے ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے جہاں ناشپاتیوں کے چند درخت، رازدار دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑ کر کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ موتی نے کان لگا کر سُننا چاہا، مگر سرسراتے ہوئے پتوں کی سائیں سائیں کے سوا اُسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

بدلُو نے ٹیلے کے پیچھے کھڑے افق کی طرف دیکھ کر کہا۔ کوئی پل میں چاند نکلا چاہتا ہے۔"

"آگے بڑھو۔" موتی نے سرگوشی میں بدلُو سے کہا۔

"اُس ٹیلے کے آگے ہمارے کھیت ہیں۔" بدلُو نے غرور بھرے لہجے میں کہا۔ اور کھیتوں سے آگے میرا گھر ہے، تمہارا گھر۔

حیرت سے موتی نے اپنے مُنہ پر ہات رکھ لیا۔ پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں۔ نہیں میں آگے نہیں جاؤں گی۔"

بدلُو نے ہنس کر کہا۔ "آگے نہیں جاؤ گی تو کہاں جاؤ گی؟ آگے ہی تو تمہارا گھر ہے۔ آگے ہی تو تمہارے کھیت ہیں۔ میرے باپ نے فصل کاٹ کے کھلیان لگا دیا ہوگا۔ ذرا چاند نکل آئے تو آگے چلیں گے۔"

"چاند کا انتظار کیوں؟" موتی نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جب چاندنی پھیل جائے تو میں اپنا کھلیان دیکھوں اور میرے گھر والے اپنی دلہن کا مُنہ دیکھیں۔"

جائے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے؟" موتی کانپتے ہوئے، لجا کر بدلو کے شانے لگ گئی۔ اتنے میں کہیں سے ایک کتّا بھاگ کر آیا اور موتی کو دیکھ کر بھونکنے لگا۔ موتی بدلو سے چمٹ گئی۔ بدلو نے کتّے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "ابے جبرے! کیا ہوا تم کو۔ پہچانتے نہیں ہو؟" پھر وہ موتی سے مخاطب ہوا۔

"یہ جبرا ہے۔ میرا کتّا!"

جبرا دونوں کو سونگھ سونگھ کر دُم ہلانے لگا اور خوشی سے ان کے گرد ناچنے لگا۔ پھر جہاں زمین اور آسمان ہونٹوں کی طرح ملتے ہیں وہاں چاند ایک مسکراہٹ کی طرح نمودار ہوا اور بدلو نے خوشی اور خوف۔ یاس اور اُمید میں ڈوبی ہوئی موتی کی حیران آنکھوں کی ڈولتی ہوئی پتلیوں کو دیکھا اور ایک پُر مسرت احساس اور گہرے اعتماد سے اُس کا ہات پکڑ کر اُسے ٹیلے کی دوسری طرف لے گیا جہاں اس کے کھیت تھے اور کھیتوں سے پرے اُس کا گھر تھا۔

ٹیلے کے دوسری جانب جاکر چھٹکی ہوئی چاندنی میں وہ چند لمحے بالکل بھونچکا کھڑا رہا۔

حدِ نگاہ تک۔ گھر کے دروازے تک کھیتوں سے فصل کٹ چکی تھی۔ مکّی کے پودوں کے بجائے کھیتوں میں صرف اُن کے ٹھنٹھ باقی رہ گئے تھے۔ اور ساری فصل سمیٹ لی گئی تھی۔ مگر کھیتوں میں کہیں پر کوئی کھلیان نظر نہیں آتا تھا۔ بدلو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا مگر اُسے مکّی کا ایک پودا تک کہیں نظر نہ آیا۔

پھر اس کی آنکھوں نے گھر کے دروازے پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے اپنے

باپ سانگلو کو دیکھا۔ اور وہ موتی کو وہیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا اپنے باپ کی طرف بھاگا ——

"کھلیان کہاں ہے؟" اُس نے وحشت سے چلاّ کر پُوچھا۔

"بنیا لے گیا!"

"سب؟" بدلُو غصّے اور مایُوسی سے چیخا۔

"سب!"

"کچھ نہیں چھوڑا؟" گہری مایوسی سے بدلُو کا دل بیٹھنے لگا۔

"ایک دانہ تک نہیں۔" سانگلو نے ہوا کی سرگوشی سے بھی آہستہ لہجے میں کہا۔ اور سر جُھکا لیا۔

پھر وہ آہستہ سے اُٹھا اور گھر کے اندر چلا گیا۔

ہولے ہولے قدموں سے موتی بدلُو کے پاس آگئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہات تھامے گھر کی دہلیز پر بیٹھ گئے اور سامنے کے ویران اور اُجاڑ کھیتوں میں مکّی کے ٹھنٹھ دیکھنے لگے۔ جو قطار در قطار سینکڑوں صلیبوں کی طرح حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔

اُنہیں دیکھ کر موتی بڑی بے بسی سے رونے لگی اور سِسک سِسک کر کہنے لگی۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ بہت بھوک لگی ہے......!"

٭ ٭ ٭

"کیا بات ہے موتی؟ تم رو رہی ہو؟ ڈارلنگ کیا ہُوا ہے تم کو؟ کچھ

یاد آرہا ہے؟ ٹھہرو میں یہ کھڑکی کھولے دیتا ہوں۔ تم اِس پھولوں سے سجے ہوئے بستر پر لیٹ جاؤ اور کھڑکی سے چھنتی ہوئی چاندنی میں سمندر کا نظارہ دیکھو۔ جب تک میں تمہارے لئے ایک کاک ٹیل اور......!"

بڑا آدمی

رگھو بھائی کے ارد گرد ہر چیز بڑی تھی نہ صرف اس کا جسم بڑا تھا۔ اس کا دل بھی بڑا تھا۔ اس کی عقل بھی بڑی تھی۔ اس کا بینک بیلنس بھی بڑا تھا (بڑے بینک بیلنس کا بڑی عقل سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے یہ سب بڑے لوگ جانتے ہیں) وہ بڑے بڑے ڈسٹری بیوٹروں سے بزنس کرتا تھا۔ بڑی بڑی پکچریں بناتا تھا۔ بڑے بڑے ستارے اپنی فلموں میں لیتا تھا اور رات کو وہسکی کے چھ بڑے پیگ پی کر سو جاتا تھا! رگھو بھائی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنے چھ فٹ کے لمبے موٹے بڑے جسم سے دیوزاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک جہاز کی طرح چلتا تھا۔ سمندر کی طرح ہنستا تھا۔ اور مائکرو فون کی طرح بولتا تھا۔ وہ بہت بڑا آدمی تھا۔

ایک دن اُس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولا۔

"منشی جی!"

"جی !" میں نے کہا۔

"مجھے ایک بڑی کہانی چاہیئے !" وہ بولا

"مدراس کی فلموں کی طرح لمبی ؟" میں نے پوچھا۔

"لمبی نہیں۔ بڑی !"

میں نے کہا۔ "بڑی کہانی تو بڑے موضوع سے بنتی ہے !"

"وضو کی بات کون کرتا ہے ؟" وہ خفا ہو کر بولا۔ وضو، تو نماز کے ٹائم پر ہوتا ہے۔ میں کہانی کی بات بولتا ہوں۔ تم وضو کی بات کرتا ہے۔ تم بھی الکدم ایڈیئٹ ہے منشی جی !"

"بجا ارشاد فرمایا آپ نے"، میں نے سر جھکا کے اقرار کیا۔

"ارشاد اور شمساد دونوں کو ہم نے نومی فلم کے لئے سائن کر لیا ہے۔ کل تک پریم بالا اور طائرہ بانو کا معاملہ بھی پٹ جائے گا !"

"چار بڑی ہیروئین ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ ہم اپنی نئی پکچر میں چار بڑی ہیروئین لے رہا ہے۔ چار بڑے ہیرو ٹاپ موسٹ ہیرو، عندلیب کمار، راج کافور، برجلیندر کمار اگروا کشٹے آنند !"

"تو چار بڑے ولین بھی لینا پڑیں گے آپ کو۔" میں نے کہا۔ "ہر ہیروئین کے لئے ایک ولین کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ بے چاری مصیبت میں نہیں پھنس سکتی اور اگر ہیروئن مصیبت میں نہ پھنسے تو ہیرو فلم میں کام کیا کرے گا ؟"

"منشی جی !" رگھو بھائی میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی سرکار !" میں نے کہا۔

"تم اکدم بدھو ہو!" وہ بولا

"آپ کی ذرّہ نوازی ہے!" میں نے آداب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم ذرہ نواز کو ولین نہیں لیں گے"! رگھوّ بھائی غصّے سے بولا۔" اس پکچر میں ہم کسی کو ولین نہیں لیں گے۔ نہ ذرہ نواز کو نہ پران کو نہ تیواری کو اس پکچر میں ہر ہیرو دوسرے ہیرو کے لئے ولین کا کام کرے گا۔ جندیب کمار، راج کا فور کے لئے۔ راج کا فور برجبیندر کمار کے لئے، برجبیندر کمار راکشے آنند کے لئے۔"

"کیا آئیڈیا ہے! کیا آئیڈیا ہے!" میں نے رگھوّ بھائی کے ہات چومتے ہوئے کہا۔ ایک ہیرو دوسرے کا ولین! ایسا آئیڈیا آج تک کسی فلم میں نہیں آیا۔ کمال ہے۔ کمال ہے، رگھوّ بھائی تم نے تو ہر ولین کی کمر اور ہر رائٹر کا قلم توڑ دیا ہے۔"

"منشی جی!" رگھو بھائی بولا۔

"جی مالک!"

"تم بہت اچھا آدمی ہے۔ اکدم فرسٹ کلاس منشی ہے۔ ہم تم کو سو روپیہ انعام دیتا ہے۔!"

رگھوّ بھائی نے خوش ہو کر جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مجھے عطا کیا۔" تم کیسا کیسا نیا آئیڈیا ہم کو دیتا ہے اسی لئے ہم تم کو کمپنی میں رکھے ہوئے ہے!"

"آپ کی عنایت ہے!" میں نے سر جھکا کے اور نوٹ کو تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، عنایت اب ہماری نہیں ہے۔ عنایت بائی کو ہم نے اپنی فلم کمپنی سے نکال دیا ہے۔ سالی بہت لفڑا کرتی تھی۔"

"کیا لفڑا کرتی تھی؟"

"بہت رگڑا کرتی تھی!"

"کیا رگڑا کرتی تھی؟"

"بہت جھگڑا کرتی تھی!" وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کیا جھگڑا کرتی تھی؟"

"بولی ہم تمہارے پکچر کے پریمیئر پر شفان کا غرارہ پہن کر جائے گا۔ میں بولا۔ تم شفان کا غرارہ پہن کر جائے گا تو اندر سے ننگا نظر آئے گا! وہ بولی، ہم اندر سے ایک ایسا پیٹی کوٹ پہنے گا جس میں ایک ایک ہزار کے نوٹ ٹکے ہوں گے۔ لوگوں کو اوپر سے شفان نظر آئے گا اندر سے نوٹ! میں نے درزی کو بلا کر پوچھا تو وہ بولا، ایسے پیٹی کوٹ پر پانچ لاکھ کے نوٹ لگے گا۔ میں نے کہا۔ سالی ہم تم کو یہ پیٹی کوٹ کیوں دے گا۔ ہم پانچ لاکھ کا بلڈنگ نہیں باندھے گا؟ ہاں ہم تم کو دس روپے کے نوٹ والا پیٹی کوٹ جرور بنا کے دے سکتا ہے۔ اس پر بھی ہمارا تیس ہزار روپیہ لگ جائے گا۔ مگر چلو اپنی مرحومہ کے لئے ہم وہ بھی لگا دے گا!"

"مرحومہ نہیں محبوبہ!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں مرحومہ ہو کہ محبوبہ ہو، ایک ہی بات ہے!" رگھو بھائی نے لاپرواہی سے کہا۔ "ہم کوئی تمہاری طرح منشی نہیں ہے کہ الفاظوں کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا

پھرے۔ اس لئے ہم نے عنایت بائی کو فلم کمپنی سے باہر نکال دیا ہے۔ کیونکہ وہ پانچ لاکھ کا پیٹی کوٹ مانگتی ہے!"

"بالکل درست کیا آپ نے!"

"تو تم ہم کو بڑی کہانی کب لکھ دو گے، منشی جی؟" رگھو بھائی نے پوچھا۔

"یہ کہانی بلیک اینڈ وہائٹ میں بنے گی یا کلر میں؟" میں نے پوچھا۔

"اُسی حساب سے کہانی سوچی جائے گی!" میں نے رُک رُک کر کہا۔

"بڑی کہانی کبھی بلیک اینڈ وہائٹ میں نہیں بن سکتی! میں اس کو کلر میں بناؤں گا اور چار کلر میں!" رگھو بھائی نے گرج کر کہا۔

"چار کلر؟" میں نے پوچھا "یعنی لال، پیلا، نیلا اور سبز؟"

"احمق ہو!" رگھو بھائی غصے سے بولا "میں اس کو ٹیکنی کلر، گیوا کلر، ایسٹ مین کلر اور سوو کلر میں بناؤں گا۔ ہر تین ہزار فٹ کے بعد کلر بدلتا جاؤں گا!"

"تو ایسی کہانی کوئی ایک رائٹر کیسے لکھ سکتا ہے؟" میں نے عاجزی سے کہا "اس کے لئے رائٹر بھی چار سے کم نہیں ہو سکتے!"

"تم بولو" رگھو بھائی بولا "میں تم کو انڈسٹری کے چار ٹاپ کے رائٹر لا کے دیتا ہوں۔ تم نام بولو!"

"سکھ رام ورما!"

"ڈن!" رگھو بھائی میز پہ ہات مار کے بولا

"ہرجانند گاگر!"

"ڈن!"

"مہندر مہاراج آنند!"

"ڈن!"

"اور چوتھا ——؟ —— چوتھا؟ ——" میں سوچنے لگا!

رگھو بھائی بولا۔

"چوتھا، وہ خطرۂ ایمان کیسا رہے گا؟"

"خطرۂ ایمان؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ پھر یکایک میری سمجھ میں آگیا اور میں فوراً بول اُٹھا۔ "اچھا اچھا۔ آپ کا مطلب اختر الایمان سے ہے؟"

"اجی نام میں کیا پڑا ہے منشی جی!" رگھو بھائی بیزار ہو کر بولا۔ "تم کو دس دفعہ سمجھایا ہے نام کے چکر میں مت پڑا کرو۔ مگر رائیٹر وہ بہت بڑا ہے!"

"ہاں رائیٹر تو وہ بہت بڑا ہے!"

"تو اُس کو لے لو، ڈن، ڈن! —— اب بولو۔ کہانی کب دیتے ہو، میں دس تاریخ کو مہورت کرنے والا ہوں!" رگھو بھائی نے اعلان کیا۔

"آج چھ تاریخ ہے اور دس کو مہورت ہے، چار دن میں کہانی کیسے بنے گی ——؟"

"کیسے نہیں بنے گی؟" رگھو بھائی نے پوچھا۔ جب میں اپنی پکچر میں چار ہیرو، چار ہیروئنیں لے رہا ہوں، اور چار کلر میں بنا رہا ہوں، تو کہانی بھی چار دن میں بنی چاہیئے۔ کیسے بھی کرو۔ اُلٹا سُلٹا کر کے مجھے چار دن میں کہانی بنا کے دو!"

"میں تم سب رائیٹر لوگوں کو کھنڈالہ لے چلتا ہوں!"

"خوب!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اور چار باورچی!" وہ بولا۔

"واہ، واہ!"

"اور چاروں ہیروئینوں کو بھی!"

"سبحان اللہ!" میں بولا

"اور چاروں ہیرو بھی چلیں گے!"

"ایں؟" میرے منہ سے مایوسی کی چیخ نکلی۔

"اور چار چھ چھوکری لوگ کو بھی ادھر ادھر سے پکڑ لیتا ہوں!"

"وہ کس لئے؟" میں نے پوچھا۔

"چھوکری لوگ آجو باجو میں رہے تو کہانی کا مصالحہ گرما گرم مجے دار اور چٹپٹا تیار ہوتا ہے۔!"

مجھے ایسا لگا جیسے میں کہانی نہیں گول گپے اور بھیل پوری کی چاٹ بنا رہا ہوں۔ مگر میں نے اپنی قسمت پر صبر کرتے ہوئے کہا "تو پھر تیاری کھنڈالے کی ——!"

※ ※ ※ ※

رگھو بھائی بہت بڑا پروڈیوسر تھا اور بہت بڑا دل رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے ان چار دنوں کا اہتمام بڑے شاندار طریقے سے کیا۔ اس نے چاروں ہیروز کے لئے ایک بہت بڑا بنگلہ کرائے پر لیا۔ پھر چاروں ہیروئنیں کے لئے الگ الگ ایک بنگلہ لیا۔ خود اپنے لئے اور اپنی نئی محبوبہ رمبھا کے لئے الگ بنگلہ لیا اور ڈائیرکٹر لوگ کے لئے کھنڈالے کے سب سے بڑے ہوٹل کی انیکسی کرائے پر

لے لی۔ یہ ایک بنگلہ نما عمارت تھی اور پہاڑی کے اوپر ایک جنگل میں تھی، ایک طرف کھڈ تھی۔ دوسری طرف اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ تیسری طرف ہوٹل کا نوکر خانہ تھا اور چوتھی طرف قبرستان تھا۔ غرضیکہ لکھنے پڑھنے والے لوگوں کے لئے یہ جگہ آئیڈئیل تھی۔ رائٹر لوگ اسی انیکسی میں لاکر ڈال دیئے گئے اور اُن کے پینے کے لئے رم کا بندوبست بھی کر دیا گیا جب کہ دوسرے پروڈیوسر صرف ٹھرا پلاتے ہیں۔ مگر رگھو بھائی کوئی معمولی پروڈیوسر نہ تھا۔ اس نے رائٹروں کے لئے رم کا۔ ایکٹر لوگوں کے لئے بلیک اینڈ وہائٹ وہسکی کا، اپنی محبوبہ کے لئے کوئنِ این کا اور اپنے لئے بلیک ڈاگ کا انتظام کیا تھا۔ کبھی کبھی محض شراب کی قسم سے اس کے پینے والے کی پوزیشن اور رُتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

پہلا دن سیر و تفریح میں گزُرا۔ ملنے ملانے میں۔ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے میں۔ ایک دوسرے کے قریب آنے میں۔ رگھوّ بھائی رمبھا کو لے کر خرید و فروخت کرنے کے لئے لوہاولہ چلا گیا۔ ہیرو لوگ ہیروئنوں کو لے کر اطالوی عشق کی پہاڑی پر چلے گئے۔ رہ گئے رائٹر لوگ سو وہ آجو باجو کی چھوکریوں سے دل بہلانے لگے، کیونکہ آدمی کی حیثیت صرف دولت ہی سے نہیں بلکہ شراب کی قسم اور عورت کے جسم سے بھی عیاں ہوتی ہے، ویسے سب اِنسان برابر ہیں!

شام کے وقت بزنس سیشن شروع ہوا جس میں کہانی پر بحث ہونا تھی اس سیشن میں چاروں ہیرو اور چاروں ہیروئین موجود تھیں اور رائٹر لوگ کو بھی بلا لیا گیا تھا۔ حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ فلمی کہانی میں رائٹر لوگ کا دخل بہت کم

ہوتا ہے اور جو رائیٹر فلمی کہانی میں زیادہ دخل دیتا ہے اُسے کسی نہ کسی بہانے فلم کمپنی سے چلتا کر دیا جاتا ہے۔ رائٹر کا زیادہ سے زیادہ کام یہ ہوتا ہے۔ کہ جب دوسرے لوگ کہانی بنالیں وہ اس پر اپنا نام دے دے!

جب سب کے جام مرتبے کے مطابق شراب سے بھر دیئے گئے تو کہانی پر بحث شروع ہوئی مگر چونکہ کہانی ایک سرے سے غائب تھی اس لیئے اِدھر اُدھر کی کہانیوں پر بحث ہوتی رہی۔ ہالی وڈ کی دو درجن کہانیاں بحث میں آئیں۔ کچھ مدراس کی فلموں کا تذکرہ چلا۔ کچھ پرانی کامیاب کہانیوں کو پھر سے بنانے کی تجویز پر غور کیا گیا۔ کچھ رائٹر لوگ ایسے موقعے پر بھی اپنے تلخ تجربے کے باوجود باز نہیں رکھے جا سکے۔ انہوں نے کچھ اپنی کہانیاں سنائیں، جو فوراً انتہائی بیزاری سے اُسی وقت رد کر دی گئیں۔ آخر میں رگھو بھائی نے ہات پر ہات مار کر اعلان کیا۔ آہا ہا۔ ایک [illegible] آئیڈیا آیا۔

[illegible] گیا! میں نے آہستہ سے کہا [illegible]

لوگ اکدم بول اُٹھے۔

[illegible] ے کر چلنے لگا۔

کہا۔

"اوپننگ کا آئیڈیا فرسٹ کلاس [illegible]

[illegible] اللہ کرنے لگے" ایک رائٹر نے میری

گر [illegible] اگلا اس خالی ہے! تیسرا رائٹر [illegible]

کہنی میں ٹھوکا مار کر [illegible]

میں نے کہا "میں کہانی پر سبحان اللہ نہیں کہہ رہا ہوں، خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ کہانی کا آئیڈیا تو آ گیا"

"کہانی کیا ہے؟" دوسرے رائٹر نے پوچھا۔

"یقیناً اچھی ہوگی!" تیسرا رائٹر بولا۔

"جلدی سے سنائیے تاکہ اُسے لکھ لیا جائے۔ مہورت میں چار ہی دن رہ گئے ہیں!" چوتھا رائٹر کاغذ پنسل تیار کر کے بولا۔

رمبھا نے مغرور نگاہوں سے سب پر نظر ڈالی۔ اس کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی، "دیکھ لیا۔ کہانی سب لوگ سناتے رہے لیکن آئیڈیا آیا تو میرے رگھو بھائی کے بھیجے میں!"

رگھو بھائی نے کسی قدر شرما کر کہا، "کہانی کا آئیڈیا نہیں ہے ابھی پہلا سین سمجھ میں آیا ہے۔ آہاہا.....؟"

"سبحان اللہ، سبحان اللہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"کس بات پر؟" ایک ہیرو میری تصدیق سے خفا ہو کر بولا۔

"پہلے سین کے آنے پر!" میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا، "اور جناب والا جب پہلا سین سمجھ میں آجائے تو سمجھو کہانی [illegible]ر ہے۔ کہانی میں اور ہوتا ہی کیا ہے۔ پہلا سین سمجھ میں آجائے۔ باقی کہانی تو خود بخ[illegible]ولہ چلا گیا۔ ہیرو لوگ ہیروئینوں کو

رمبھا میری طرف تعریفی نگاہوں [illegible] گئے رائیٹر لوگ سو وہ آج باجر کی چھوٹ پسند آئی تھی۔ اس نے میری طرف مسکر[illegible]ت صرف دولت ہی سے نہیں۔ اس کی ساڑھی بڑی خوبصورت تھی۔ چہرے کا میک اپ تر... ورت تھا اور زیور اُس کے بڑے خوبصورت تھے اور جس عورت کے پاس یہ تینوں چیزیں خوبصورت ہوں۔ وہ بڑی خوبصورت ہوتی ہے۔

"بے شک، بے شک!" ایک ہیرو سر ہلا کر بولا، "فلم کی اوپننگ بڑی اہم ہوتی ہے اور اگر فلم کی اوپننگ دھانسو، بن جائے تو سمجھو پوری کہانی بن گئی!"

رگھو بھائی کھانس کر بولے "فلم یوں شروع ہوتی ہے کہ — ایک بہت بڑا ہال ہے۔ بہت بڑا ہال ہے۔ اس کے ساٹھ دروازے ہیں۔ اور تین سو ستون ہیں اور چار سو فانوس ہیں اور اس کے اندر آٹھ سو، لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں"

"آٹھ سو؟" رائیٹر لوگ کے آجو باجو کی لڑکیاں خوشی سے چلائیں۔ کیوں کہ اگر ڈانس کرنے کے لئے آٹھ سو لڑکیاں ہوں گی تو ان کو کام ملنا ضروری تھا!

"آٹھ سو لڑکیاں! — ایک سیٹ پر ناچ رہی ہیں!" رگھو بھائی خوشی سے چلایا۔ "یہ میری فلم کی اوپننگ ہے! سمجھے۔ آٹھ سو لڑکیاں، ایک سیٹ پر ناچ رہی ہیں!"

"دو سو ٹیکنی کلر میں، دو سو گیوا کلر میں، دو سو ایسٹ مین کلر میں ناچ رہی ہیں" میں نے تجویز پیش کی!

"منشی جی!" رگھو بھائی خفا ہو کر چلایا۔ "تم اکدم گدھے ہو!"

"بجا فرمایا!" میں نے آہستہ سے کہا اور اپنی خفت مٹانے کے لئے پنسل منہ میں لے کر چبانے لگا۔

"اوپننگ کا آئیڈیا فرسٹ کلاس ہے" دوسرا رائٹر بولا

"مگر میرا گلاس خالی ہے!" تیسرا رائٹر بولا

"اوپننگ تو اچھا ہے۔ مگر اس میں ہیرو کہاں ہے؟" پہلا ہیرو بولا۔

"ہیرو کو میں لے کر آتا ہوں"۔ رگھو بھائی جلدی سے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ اور جلدی سے رمبھا نے اپنی کرسی کی اوٹ سے بلیک ڈاگ کی بوتل سے ایک پیگ، گلاس میں، سوڈے کے ساتھ، ڈال کے رگھو بھائی کو پیش کیا۔ رگھو بھائی نے ایک گھونٹ بھرا۔

"اب میں ہیرو کو فلم میں لاتا ہوں!" رگھو بھائی نے دونوں ہات پھیلا کر فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کے کہا۔ "اب میں ہیرو کو فلم کے اندر نکالتا ہوں!" اس نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اپنی فلم کے اندر سے ہیرو کے بجائے کسی خرگوش کو نکالنے جا رہا ہو۔

"دیکھئے! ہال کے اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔ ہال کے باہر ہیرو گھوڑا دوڑاتے ہوئے آتا ہے۔ ٹپا ٹپ! ٹپا ٹپ!! ٹپا ٹپ!!!"

"چھپا چھپ! چھپا چھپ!! چھپا چھپ!!!" دوسرا رائٹر بولا۔

"گھپا گھپ! گھپا گھپ!! گھپا گھپ!!!" چوتھا رائٹر بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے!" تیسرا رائٹر بولا۔

مگر اُس کی کمزور آواز کسی نے سُنی نہیں۔ رگھو بھائی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا اور چلّا کر کہنے لگا۔ "ہیرو آتا ہے، گھوڑا دوڑاتے ہوئے! ٹپا ٹپ! ٹپا ٹپ!! ٹپا ٹپ!!! اُس کے ہات میں چابک ہے۔ سڑاک سے وہ چابک گھوڑے کے مُنہ پر مارتا ہے اور فٹاک سے اس کی پیٹھ سے اُترتا ہے اور دھماک سے سیدھا اندر دروازے سے ہال میں گھس جاتا ہے!"

"سُبحان اللہ، سبحان اللہ!" میں جلدی سے چلّایا کہ کہیں کوئی دوسرا رائٹر پہل نہ کر جائے۔!

رگھو بھائی نے خوش ہو کر میری طرف دیکھا۔ بولا۔ "ایک بات ہے منشی جی۔ کہانی تم خوب سمجھتے ہو!"

"آپ کی مہربانی ہے!" میں نے آداب بجالاتے ہوئے کہا۔ "اگر اجازت ہو

تو ایک آئیڈیا میں بھی عرض کروں؟

"بولو، بولو!" رگھو بھائی خوش ہو کر بولے۔

"ہیرو کو گھوڑے سے مت اتاریئے۔ وہ سڑک سے چابک بھی مارے اور فناک سے گھوڑے کی پیٹھ پر اچھلے بھی مگر اترنے کے بجائے سیدھا ہال میں آجائے گھوڑے پر سوار اور اندر آٹھ سو لڑکیاں ڈانس کرتی ہوتی۔ انہیں دیکھ کر ہیرو بھی گھوڑے کو ناچنے کے لئے اشارہ کرتا ہے اور اشارہ پاتے ہی اس کا گھوڑا بھی ناچنے لگتا ہے۔ ذرا خیال کیجئے رگھو بھائی۔ آٹھ سو لڑکیاں۔ ڈانس کر رہی ہیں اور ان کے بیچ میں ایک گھوڑا بھی ڈانس کر رہا ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر سے ہیرو۔ ہات نیچے بڑھا کر ایک لڑکی کو اوپر اٹھا لیتا ہے اور اس کے ساتھ گھوڑے کی کاٹھی پر کھڑا ہو کر ڈانس کرنے لگتا ہے۔ وہ لڑکی رنبھا ہے!"

"ہُرّے!" رمبھا زور سے خوشی سے چلائی۔

"بالکل یہی میں سوچ رہا تھا" رگھو بھائی بولا

"کیا بات پیدا کی ہے تم نے منشی جی!" پہلا ہیرو زور سے بولا، تم نے میری اینٹری تو طے کر دی۔ کمال کر دیا ہے۔ جی چاہتا ہے تمہارا قلم چوم لوں"

"مگر دوسرا ہیرو کدھر سے آئے گا؟" دوسرا ہیرو ذرا اداس ہو کر بولا۔

"کدھر سے بھی آسکتا ہے!" میں نے کہا۔ ہال کے ساٹھ دروازے ہیں۔ وہ کدھر سے بھی آسکتا ہے!"

"میں دروازے سے نہیں آؤں گا!" دوسرے ہیرو نے خفا ہو کر کہا۔

"پھر تم کدھر سے آؤ گے؟" رگھو بھائی نے دوسرے ہیرو سے پوچھا۔

"میں ؟ — میں اب ایک آئیڈیا دیتا ہوں۔ ہال میں آٹھ سولہ لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں۔ لڑکیوں کے بیچ میں گھوڑا ڈانس کر رہا ہے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر نمبر ون ہیرو نمبر ون ہیروئین رمبا ڈانس کر رہی ہے۔ اتنے میں زور کا ایک پٹاخہ چھٹتا ہے اور چٹاخ سے روشن دان کا کانچ ٹوٹ جاتا ہے اور میں — دوسرا ہیرو — روشندان سے چھلانگ لگا کر ہال میں کود پڑتا ہوں اور چلا کر کہتا ہوں..... یاہو !"

"گریٹ !" دوسرا رائٹر بولا۔

"سپرب !" چوتھا رائٹر بولا۔

"مگر میرا گلاس خالی ہے !" تیسرا رائٹر بولا

"کہانی کیا تیر کی طرح سیدھی جا رہی ہے !" رگھو بھائی نے فخر سے کہا۔

"کہانی کو اگر اچھی اوپننگ مل جائے" میں نے کہا "تو سمجھو بیڑا پار ہے !"

"مگر تیسرا ہیرو کیسے اندر آئے گا ؟" تیسرے ہیرو نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"آخر کہانی میں ہم بھی تو ہیں !"

"بے شک ہیں آپ !" دوسرا رائٹر بولا "میرے خیال میں آپ اگر پیدل چل کر آئیں تو کیا رہے گا ؟"

"بالکل نہڈل !" تیسرا ہیرو خفا ہو کے بولا، پہلا ہیرو گھوڑے پر آئے، دوسرا روشندان سے چھلانگ لگا کے آئے اور میں پیدل چل کے آؤں۔ آپ گھاس کھا گئے ہیں کیا ؟"

تیسرا رائٹر جس کا گلاس اب تک خالی تھا۔ خالی گلاس کو میز پر زور سے مار کر بولا "ایک آئیڈیا میں بتاتا ہوں اور جواب نہیں ہے صاحب تیسرے ہیرو کی انٹری

کا۔ واہ! واہ! کیا شاندار اینٹری دی ہے میں نے!"

"کیا ہے؟" رگھو بھائی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"آہا ہا" تیسرا رائیٹر سر ہلا کر بولا۔ "کبھی کبھی کیا آئیڈیا سوجھتا ہے مجھے بھی، واہ واہ۔ کمال کر دیا ہے میں نے بھی۔ او ہو۔ ہو۔ غضب کی اینٹری ہے۔ سچ کہتا ہوں، ایسی اینٹری دی ہے میں نے کہ ساری فلم کو اکھاڑ کے پھینک دو مگر اس اینٹری کو اکھاڑ کے نہیں پھینک سکتے!"

"کیا ہے؟ جلدی بولو بھائی!" رگھو بھائی بے حد بے چین ہو کر بولا۔

"سنیئے" تیسرے رائیٹر نے چلا کر کہا۔ "پہلا ہیرو گھوڑے پر آتا ہے، دوسرا ہیرو روشندان سے چھلانگ لگاتا ہے۔ مگر میرا ہیرو ان دونوں سے اونچا ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر آتا ہے۔ ایک ہیلی کاپٹر میں! سمجھے آپ؟ ہیلی کاپٹر فراٹے بھرتا ہوا اُڑتا چلا آتا ہے اور ہال کے گرد چکر لگاتا ہے۔ ایک چکر، دو چکر، تین چکر، چار چکر، پانچ چکر، چھٹے چکر میں وہ ہیلی کاپٹر کو اُڑاتا ہوا دروانے سے سیدھا اندر داخل ہو جاتا ہے اور اندر جاتے ہی ہیلی کاپٹر کو پیانو کے اوپر کھڑا کر دیتا ہے اور ناچتا ہے۔ چکا چکا بوم چک! چکا چکا بوم....."

"برو بر!" اکدم برو بر!! رگھو بھائی خوشی سے چلایا۔ "یہ اینٹری اکدم پاس ہے، بیرہ رائیٹر صاحب کا گلاس بھر دو!"

"مگر میں کدھر ہوں؟" چوتھا ہیرو رنجیدہ سُر میں بولا۔ "میں کدھر سے آتا ہوں اس سین میں؟"

"تمہارے لئے ایک خندق کھودنی پڑے گی!" میں نے چوتھے ہیرو سے کہا۔

"ہال کے نیچے سے ؟" چوتھے ہیرو نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں !" میں نے جواب دیا۔

"پھر !" چوتھے ہیرو نے پوچھا۔

"پھر ہال ، کا ایک کونا پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے چوتھا ہیرو نکلتا ہے، ہات میں پستول لئے ہوئے۔"

چوتھا ڈائیرکٹر بولا: "اور وہ ہال میں آتے ہی دھائیں ، دھائیں گولیاں چلانی شروع کرتا ہے۔ چیخم دھاڑ۔ دھوم دھڑاکا ، لڑکیاں تتر بتر ہوتی جاتی ہیں چوتھا ہیرو آگے بڑھ کر گھوڑے پر ناچتے ہوئے ہیرو کو زمین پر گرا دیتا ہے !"

"اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر ——— اور رمبھا کو لے کر ہال سے باہر نکل جاتا ہے !" میں نے دونوں ہات اوپر اُٹھا کر کہا۔

سب نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور رمبھا مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھنے لگی۔

* *

آدھی رات ، چاند اور سنّاٹا !

میرے ایک ہات میں جام تھا، دوسرے میں رمبھا کی کمر تھی اور ہم دونوں کے بیچ میں بلیک ڈاگ کی بوتل رکھی تھی۔

"ڈارلنگ !" رمبھا میری طرف میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم کتنے بڑے حرامزادے ہو۔ کیسے مجھے پہلے ہی سین میں لے آئے کہ چاروں ہیروئنیں منہ دیکھتی رہ گئیں !"

"تم بھی کچھ کم سوئٹ نہیں ہو، پیاری!" میں نے اس کی کمر کو کستے ہوئے کہا۔ "کیسے تم پروڈیوسر کو شراب میں اوندھا چھوڑ کر اس وقت میرے پاس آگئیں اور بلیک ڈاگ کی پوری بوتل ساتھ لے آئیں!"

ہم دونوں آدھی رات کے وقت پروڈیوسر کے بنگلے سے ذرا دُور اطالوی مشن کی پہاڑی پر ایک ڈھلان کے نیچے گل مہر کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے تھے۔ یہ رات پریمیئر کی رات کی طرح حسین تھی۔ سامنے ایک چھوٹا سا آبشار، فلم کی خالی ریل کی طرح چل رہا تھا اور دُور کہیں کسی ریل گاڑی کی کُو کُو چھتر گپت کی کسی دھن کی طرح سنائی دے رہی تھی۔

"تمہاری وجہ سے میں نے بلیک ڈاگ بھی چکھ لی ورنہ آج تک تو کبھی چکھی نہیں تھی۔" میں نے رمبھا سے کہا۔

"یہ دُنیا کی سب سے اچھی وہسکی ہے جناب!" رمبھا غرور سے بولی۔

"تم بھی دنیا کی سب سے حسین عورت ہو۔" میں نے رمبھا سے کہا۔

"مجھے بھول مت جانا۔" رمبھا بولی۔ "ابھی تو کہانی کا پہلا سین ہی ہوا ہے۔" "دیکھتی جاؤ۔ آگے کے سینوں میں بھی تمہیں یوں گھماؤں گا کہ چاروں ہیروئنیں ہاتھ ملتی رہ جائیں گی!"

رمبھا میرے سینے سے لگ گئی اور اک آہ بھر کر بولی، "مجھے تمہاری حرامزدگی پر پورا بھروسہ ہے۔"

میں اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔

* * *

رات خالی۔
خالی جیسے شراب کی بوتل۔
رات تھکی ہوئی۔
جیسے پہاڑ کی باہوں میں لپٹے ہوئے دو جسم۔
رات بے سُدھ،
جیسے تیسرے پہر کی اُوس میں ڈوبے ہوئے جسم، شبنم دھیرے دھیرے پھوہار، کی طرح برستی ہوئی، پھول ٹوٹ ٹوٹ کر ٹہنیوں سے گرتے ہوئے، بے آواز، بے سُدھ، سپنوں میں کھوئے ہوئے......

یکایک کسی نے مجھے زور سے جھنجوڑ کر جگایا۔
میں ہڑبڑا کر اُٹھا۔
میرے سر پر رگھو بھائی کھڑا تھا۔
رمبھا نے اِک نگاہ اُٹھا کے رگھو بھائی کی طرف دیکھا وہ اک لمحے کے لئے خوف سے چونکی۔ پھر سر جھکا کر سسکنے لگی۔ ایک مجرم کی طرح۔
رگھو بھائی نے گھور کر رمبھا کی طرف دیکھا میرے قریب سے اُٹھا کر خالی بوتل کو دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر غصّے سے چلّایا
"تم؟ تم؟ — میرے منشی ہو کر یہ گستاخی؟" رگھو بھائی کے مُنہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ میں تم کو ایسا کمینہ اور چور نہیں سمجھتا تھا!"
"معاف کر دو رگھو بھائی!" میں نے جلدی سے اپنے دونوں ہات اُس کے پاؤں پر رکھ دیئے۔" مجھ سے بڑی گستاخی ہو گئی! میں نشے میں اپنا مقام تک بھول گیا

اور تمہاری لڑکی کو چھڑا لایا یہاں!"

"لڑکی؟ لڑکی کی کون بات کرتا ہے؟" رگھو بھائی نے چلا کر کہا۔ "سالی لڑکیاں تو بمبئی میں گیارہ ہزار مل جاتی ہیں۔ مگر بلیک ڈاگ نہیں ملتی۔ سارے شہر کو چھان کر میں دو بلیک ڈاگ لایا تھا۔ ایک میں نے آج پی لی، دوسری تم نے آج رات چرا لی:"

"ہائے!" رگھو بھائی نے بلیک ڈاگ کی خالی بوتل اٹھائی اور گلوگیر لہجے میں بولا "اب میں کل بلیک ڈاگ کہاں سے پیوں گا؟ اور پرسوں کیا پیوں گا؟"

رگھو بھائی نے بلیک ڈاگ کی خالی بوتل اپنے سینے سے لگالی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا!

چابک

وہ امیر تھا۔ خوب صورت تھا۔ خوب صورت عورتوں کا دلدادہ تھا۔ شاعری کا عاشق تھا۔ فنونِ لطیفہ کا پرستار تھا۔ سیاست دانوں کا سرپرست تھا۔

اُس کی بادشاہت بہت بڑی تھی۔ وہ سیمنٹ کا بادشاہ تھا۔ کوئلے کا بادشاہ تھا۔ لوہے کا بادشاہ تھا۔ اور مینگنیز کا بادشاہ تھا۔ اور اب ریان کا بادشاہ ہونے جا رہا تھا، گورنمنٹ نے اس کی ریان کی مل کے لیے ساڑھے تین کروڑ روپے کا فارن ایکس چینج منظور کیا تھا۔ اور جب کوہسار میں اس کی ریان مِل کھڑی ہو جائے گی۔ وہ ایشیا میں ریان کا سب سے بڑا پروڈیوسر کہلائے گا۔ ریان کا بادشاہ!

اُس کی بیوی کے پاس دس کروڑ روپے کا زیور تھا۔ اُس کے کتے ہر سال گاڑی بدلتے تھے۔ اس کے دربار میں مختلف حکومتوں کے وزیر حاضر ہوتے تھے۔ اپنے بیٹوں، بھانجوں اور بھتیجوں کی درخواست لے کر اور وہ سب وزیروں کی درخواست سنتا تھا اور اُنکے بیٹوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو اپنی ملوں میں شاندار نوکریاں عطا کرتا تھا۔ کسی کو ڈیڑھ ہزار، کسی کو

دو ہزار، کسی کو چار ہزار۔ اُس کے قلم کے ایک دستخط سے سیکڑوں لوگوں کی تقدیریں بدل جاتی تھیں۔

سنتے ہیں کہ اُس کے ملک کے لوگ سونے کو بہت چاہتے تھے۔ اس لئے وہ اپنے دیس کے لوگوں کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کویت اور خلیج فارس کے امیر شیوخ سے چالیس کے بھاؤ میں سونا خریدتا تھا۔ اور نوے روپے فی تولہ کے حساب سے اپنے ملک میں بیچ دیتا تھا۔ گذشتہ دس سال میں اس نے ایک ارب کا سونا سمگل کیا اور پچاس کروڑ روپے کا منافع کما لیا۔ اور جو شخص پچاس کروڑ روپے کما لے۔ قانون اُسے چھو بھی نہیں سکتا ہے!

وہ بے حد مخلص، فیّاض، مخیّر انسان تھا۔ اور اپنے دوستوں میں بے حد مقبول تھا۔ اُس نے اپنے ہر دوست کی مشکل وقت میں مدد کی تھی۔ اور دل کھول کر مدد کی تھی۔ اُس کی فیاضی، فراخ دلی اور شاہ خرچی کے افسانے سارے ملک میں مشہور تھے۔ اُس نے ہر مذہب کے لئے معبد بنوائے تھے۔ ... گھر اور یتیم خانے کھولے تھے۔ شفاخانے اور یونیورسٹیاں تعمیر کی تھیں۔ وہ ادیبوں کو انعام بانٹتا تھا۔ مصوروں کو اپنے خرچ پر پیرس بھیجتا تھا۔ اور صحافیوں کے لئے اخبار چلاتا تھا۔ اور مرحوم مشاہیر کی برسیاں مناتا تھا۔ ایسے تمام موقعوں پر اس کی تقریر اور تصویر ملک کے اکثر اخباروں میں پہلے صفحے پر شائع ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ پہلے صفحے کا آدمی تھا۔

وہ محبت کرنے والا انسان تھا۔ اُسے زندگی سے اور زندگی کی تمام خوبصورت چیزوں سے محبت تھی۔ دوست، کتابیں، پھول، عورتیں، کاریں، کتے، فرنیچر، ملبوس ہر شے قدر اوّل کی ہونی چاہیئے۔ یہ اس کا عقیدہ تھا۔ وہ اپنے ہر عقیدے کو حقیقت

میں تبدیل کر لیتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ہر عقیدے کی قیمت ادا کر سکتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھا۔ جو اپنے خیموں کی تکمیل کے لئے خالی ہاتھ دُعا کے لئے اٹھاتے ہیں۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ دُعا کرنے سے خدا تو مل سکتا ہے۔ لیکن خوب صُورت عورت نہیں مل سکتی۔ اس لئے وہ دعا کرنے کے بجائے قیمت ادا کرتا تھا۔ اُسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ چیزوں کی قیمت ہوتی ہے۔ قیمت سے منافع نکلتا ہے۔ منافع سے طاقت حاصل ہوتی ہے۔ طاقت سے محنت جھکتی ہے۔ محنت کے جھکنے سے منافع حاصل ہوتا ہے۔ منافع سے طاقت ملتی ہے۔ یہ ایک گول چکر تھا۔ جس کے اندر اُس کی حیثیت ایک سورج کی تھی اور سُورج کو کوئی فتح نہیں کر سکتا!

مگر وہ ایک رحم دل سُورج تھا۔ اور اپنے دشمنوں کو جلا کر خاک کر دینے کے بجائے انہیں اپنی قوت اور کشش سے اپنا تابع بنا لیتا تھا۔ اس طرح کہ وہ پھر زندگی بھر اس کے مدار کے گرد گھومتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر اس نے ایک دن اپنے سب سے ذہین دشمن راہی کو اپنے گھر بلایا، اور اس سے پوچھا۔

"تم میرے خلاف کیوں لکھتے ہو؟"

"کیونکہ میں تمہارا دشمن ہوں۔"

"میری دشمنی سے تمہیں کیا ملا؟"

"مجھے فاقے ملے، پھٹے چیتھڑے ملے۔ گالیاں ملیں، قید و بند کی تنہائی ملی، میری محبوبہ مجھ سے کنارہ کش ہو گئی۔ میرے دوست کنّی کاٹ گئے۔ میں وقت سے پہلے بڈھا ہو گیا۔" راہی نے اقبال کیا۔

"میں تمہاری تقدیر بدل سکتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"میں تمہیں اپنے سب سے بڑے اخبار کا سب سے بڑا ایڈیٹر بنا دوں گا۔ تمہیں ماہانہ دس ہزار روپے تنخواہ دوں گا تم ہر چیز خرید سکو گے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" راہی نے جواب دیا "لیکن میں اپنی تقدیر بدلنا نہیں چاہتا۔ میں زندگی بھر تمہارے خلاف لکھتا رہوں گا۔"

"کیوں —؟"

"کیوں کہ تم سورج ہو اور مجھے کسی سیّارے کی طرح تمہارے گرد طواف کرنا پسند نہیں ہے۔"

"تمہیں کیا پسند ہے؟"

"مجھے شخصی آزادی پسند ہے۔"

"مگر شخصی آزادی ہے کدھر؟" اُس نے خفا ہو کر راہی سے پُوچھا "میں نے تو بہت ڈھونڈا اپنی مملکت میں شخصی آزادی کو، مگر مجھے تو شخصی آزادی کہیں نہ ملی۔ البتہ شخصی آزادی کے وہم میں گرفتار بہت سے لوگ ملے۔ وہ ایک ادیب ہے جو مہینے بھر قلم کی گھس گھس سے دو کہانیاں بڑی مشکل سے لکھتا ہے۔ اور معاوضے میں ایک تولہ سونا پاتا ہے اب ایک تولہ سونے سے تم کتنے دن کی آزادی خرید سکتے ہو؟ وہ ایک کلرک ہے جس نے اپنی زندگی پچھتر روپے سے شروع کی تھی۔ پندرہ برس کی ملازمت کے بعد وہ آج پونے دو سو پاتا ہے، اور ہمارے شخصی آزادی کے فخر کے اس کے سر پر اب ایک بال بھی نہیں اُگتا ہے۔ وہ ایک حلوائی ہے، بنارسی واس او سمتی، جلیبیاں تلتے تلتے اور بھٹی کی آنچ میں آنکھ جھپکتے اس کا مُنہ کالا ہو گیا ہے۔ اور رُوح اس کی دھوتی کی

طرح کثیف ہو گئی ہے۔ اور بیس سال کی شخصی آزادی کے بعد اُس کی پاس بُک میں صرف پونے دو ہزار روپے جمع ہیں۔ جس سے اُس کے گٹھیا کا بھی علاج صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور وہ میرا یار کملا کر ہے ــــ ٹیکسی ڈرائیور! شخصی آزادی کا رسیا۔ جس دن دس روپے کما لیتا ہے، اپنا دھندا بند کر کے دو روپے کا ٹھرّا پی لیتا ہے اور ایک رُوپے کی بھُنی ہوئی کلیجی کھا کر اپنی بیوی کا کلیجہ کھانے پر تیار ہو جاتا ہے ــــ اور ایک تم ہو مسٹر راہی ــــ صبح سے رات تک ایک ہی کرسی سے بندھے بندھے گدھے کی طرح کام کرتے ہو۔ آخر تمہاری شخصی آزادی اور ذات کی لگن صبح آٹھ بجے سے رات کے سات بجے تک ایک لکڑی کے تین مربع فٹ تختے تک کیوں محدود ہو جاتی ہے؟ مدتیں گذریں تم نے کبھی کھلے آسمان میں اُڑتے ہوئے بادلوں کو نہیں دیکھا ــــ زمین سے کونپل کو اُگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سمندر میں خوب صورت مچھلیوں کو تیرتے نہیں دیکھا ــــ اور تم سمجھتے ہو تم آزاد ہو۔ ارے غلام! ابن غلام!! ابن غلام!!! تمہارے ہاتھ میں جو فونٹین ہے وہ میری فیکٹری سے آیا ہے۔ یہ سوتی کپڑے جو تم اپنے جسم پر پہنے ہوئے ہو، یہ میرے کارخانے سے آئے ہیں۔ یہ میرا سیمنٹ ہے، جو تمہاری کھولی میں لگا ہے۔ یہ میری چینی ہے جو تم ہر روز اپنی چائے میں گھول کر پیتے ہو۔ اور چائے بھی میرے ہی باغات سے آتی ہے۔ یہ اخبار جو تم صبح کھول کر پڑھتے ہو، کوئیلا جو تم اپنے چولہے میں جلاتے ہو۔ لوہے کا بلیڈ جس سے تم اپنی داڑھی مونڈتے ہو۔ اور شخصی آزادی کے خوش رنگ وعدے جن سے تم ہر روز اپنی عقل کی حجامت کرتے ہو، یہ سب میرے ہی کارخانے سے ڈھل کے آئے ہیں بدھو! مگر تم نے کبھی تو سوچا ہوتا تمہارے گھر میں آخر کونسی چیز تمہاری ہے؟ سٹیل کے برتن؟ جوٹ کی بوری؟ دوا کی شیشی؟ کتابوں کی الماری؟ ارے احمق!

تمہاری ساری زندگی میرے کارخانے کے پٹے پر گھوم رہی ہے، اور تم سمجھتے ہو آزاد ہو؟ ارے بے وقوف! تم تو جس دن مرو گے، اُس دن تمہارا کفن بھی میرے ہی کارخانے سے آئے گا۔ اس لئے احمق نہ بنو! حقیقت کو سمجھو!! اور اپنے بادشاہ کو سلام کرو؟

یکایک راہی کی آنکھوں سے پٹی اُتر گئی۔ اور حقیقت ننگے روپ میں اس کے سامنے آگئی ـــ اُس نے جھک کر بادشاہ کو سلام کیا۔ اور اس کے سامنے مودّب کھڑا ہو گیا ـــ بادشاہ نے راہی کو اپنے سب سے بڑے اخبار کا سب سے بڑا ایڈیٹر بنا دیا۔ اور راہی نے بادشاہ سے پوچھا۔

"سب سے پہلا ایڈیٹوریل کس سلسلے میں ہوگا؟"

"شخصی آزادی کی تعریف میں" بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ کیونکہ مجھے احمق چاہئیں بہت سے۔ اور شخصی آزادی کا پہلا کرتب یہ ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کو، زیادہ سے زیادہ عرصے تک بے وقوف بنایا جا سکتا ہے؟"

غرض کہ ذہانت میں، شرافت میں، دولت میں، طاقت میں، اس کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان تھا، اور اس میں کوئی خامی نہ تھی ـــ سوائے اس کے کہ وہ اپنی عورتوں کو پیٹتا تھا ـــ!

یہ اُس کی ایک عجیب عادت تھی۔ جن عورتوں سے وہ محبت کرتا تھا، اُنہیں پیٹتا بھی تھا۔ اور جس عورت کو جس شدّت سے چاہتا تھا، اُسی شدّت سے اُسے پیٹتا بھی تھا ـــ یہ ایک عجیب و غریب بات تھی کہ وہ شخص جو اپنی زندگی میں ایک

کا کہ سوچ کو مارنے سے بھی گریز کرتا ہو۔ وہ کس طرح ایک عورت پر ہاتھ اُٹھا سکتا ہے؟
مگر حقیقت یہی تھی۔ اور وہ اس حقیقت کا ٹھیک طرح سے تجزیہ نہ کر سکتا تھا۔ اُسے
اپنی یہ عادت پسند نہیں تھی، اور اس عادت کو دور کرنے کے لئے اس نے بڑے
بڑے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ بڑے بڑے ماہرِ نفسیات بلا کر، اُن سے علاج کرایا۔
مگر کوئی اس کی اس عادت کو دور نہ کر سکا۔ نہ اس عادت کی نفسیاتی توجیہہ کر سکا۔ اور
اس کی یہ عادت کسی ڈاکٹر کے علاج سے دور نہ ہو سکی۔

اس کی خواب گاہ میں ایک لمبی چابک تھی۔ یہ ہمیشہ اس کے بستر کی تہہ کے نیچے
پڑی رہتی تھی۔ پہلے تو وہ لڑکی کو دانتوں سے کاٹتا تھا، پھر ناخنوں سے اس کی جلد پر
کھرونچے ڈالتا تھا اور جب اس سے بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ تو اس کی پیٹھ ننگی کر کے
اُس پر چابک مارتا تھا۔ اور جوں جوں درد کی شدت سے لڑکی بلبلاتی، وہ زور زور
سے چابک مارتا تھا۔ اور زور زور سے قہقہے لگا کر ہنستا تھا۔ حتیٰ کہ لڑکی درد کی شدت
سے بے ہوش ہو جاتی۔ اور لڑکی کے بے ہوش ہوتے ہی، جیسے اُسے خود ہوش آجاتا۔
اور وہ شدید پچھتاوے، اور انسانی ہمدردی اور خدا ترسی کے احساس سے مجبور ہو کر
افسوس سے ہاتھ ملنے لگتا۔ بے ہوش لڑکی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر بستر پر لٹا دیتا۔
اس کے زخموں اور کھرونچوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر انہیں بار بار چومتا۔ اور لڑکی کو پیارے
پیارے ناموں سے پکارتا۔ ٹیلی فون کر کے ڈاکٹر کو بلاتا۔ دن رات اس کی دوا دارو میں
مصروف رہتا۔ تیمارداری کرتے کرتے اُسے ٹھیک کر لیتا۔ پھر پندرہ بیس روز، مہینے
دو مہینے کبھی کبھی تین چار مہینے، خیریت سے گذر جاتے۔ حتیٰ کہ ایک دن پھر اس پر وہی
بھوت سوار ہو جاتا۔ اور وہ اپنی محبت کے شدید جذبے سے متاثر ہو کر پھر وہی چابک

نکال لیتا۔

بالعموم لڑکیاں پہلی مار کے بعد ہی بھاگ جاتی تھیں۔ البتہ کچھ ڈھیٹ ایسی بھی تھیں جو تیسری یا چوتھی مار کے بعد بھاگی تھیں۔ مگر وہ ایک فیاض اور فراخدل انسان تھا۔ اس لئے وہ اپنی ہر بھاگی ہوئی معشوقہ کو معاف کر دیتا تھا۔ اپنی محبت کے دوران میں اور قطع تعلقات کے بعد وہ ان لڑکیوں کو انعام واکرام سے اس قدر نوازتا تھا، کہ آج تک کسی لڑکی نے اُس کے خلاف عدالت میں جانے کی خواہش ظاہر نہ کی تھی۔ محبت کے شروع میں وہ لڑکی کو ایک عمدہ گاڑی خرید کر دیتا تھا۔ ایک فلیٹ خرید کے دیتا تھا۔ پچاس ہزار روپے اس کے بنک میں رکھ دیتا تھا۔ اور جس دن چابک مار مار کر اُسے بے حال کر دیتا تھا۔ اس دن اپنی پشیمانی ظاہر کرتے ہوئے وہ سیدھا تین لاکھ روپے کا چیک کاٹ کے اُسے دے دیتا تھا۔ جن لڑکیوں نے اُس سے تین چار بار مار کھائی تھی، انہوں نے دس بارہ لاکھ روپیہ اکٹھا کر لیا تھا ایک ہی سال میں۔ حالانکہ کروڑوں آدمیوں کو زندگی بھر یہ رقم دستیاب نہیں ہوتی۔ اس لئے اعلیٰ سوسائٹی میں ایسی لڑکیوں کو بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ اور جونہی کوئی لڑکی کسی فیشن ایبل سجے ہوئے ڈرائینگ روم میں اس کے ساتھ داخل ہوتی، اور لوگ اس کے چہرے پر ناخنوں کے کھرونچے دیکھتے، اس کی گردن اور باہوں پر چابک کی مار کے نیل گوں دھبے دیکھتے، یا زخموں پر سفید سفید پٹیاں بندھی پاتے تو فوراً سمجھ جاتے کہ آج اس لڑکی کو تین لاکھ کا چیک ملا ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد لڑکی بھی اس فخر سے اپنے زخموں کے نشان دکھانے لگتی تھی، جیسے وہ کسی جنگ میں جیتے ہوئے بہادری کے تمغے دکھا رہی ہو۔ قطع تعلقات کے بعد ایسی لڑکیوں کی شادی بھی جلد ہو جاتی تھی۔ کیوں کہ ایسی لڑکیاں جو خوبصورت ہوں، اور زندگی بھر کی گذر بسر کا اثاثہ بھی اپنے ساتھ

لائیں۔ آج کل آسانی سے کہاں دستیاب ہوتی ہیں؟ اس لئے اُسے اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر اچھی سے اچھی اور عمدہ سے عمدہ لڑکی کے انتخاب میں کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اور پندرہ بیس لڑکیوں کو چابک مارنے کے بعد وہ یہ بھول بھی گیا کہ اس کا شغل کسی طرح غیر معمولی یا غیر فطری ہے۔ دھیرے دھیرے اُسے محسوس ہونے لگا کہ جو کچھ وہ کرتا ہے وہ نہ صرف اس کی اپنی فطرت کے مطابق ہے بلکہ عورت کی فطرت کے مطابق بھی ہے، اور محبت کی فطرت کا تقاضہ بھی ہے۔ دھیرے دھیرے اُسے اس شغل میں بے حد لذّت محسوس ہونے لگی اور وہ اپنی لذت کی خاطر جلدی جلدی لڑکیاں بدلنے لگا۔ جس سے اس کی عزت اور مقبولیت اعلیٰ سوسائٹی میں اور بڑھ گئی۔ اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ وہ نہ صرف حسین اور قبول صورت لڑکیوں کے مستقبل کا بہترین محافظ ہے۔ بلکہ اونچے خاندان کے مگر نادار کنواروں کا روزی رساں بھی ہے۔ اور اس کا عیب اس کی خوبیوں میں شمار ہونے لگا۔

ہوتے ہوتے وہ لڑکیوں کی گنتی بھول گیا۔ اُن کے چہرے بھی اُسے یاد نہ رہے۔ اب وہ اگر کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا، تو سب سے پہلے اس کی جلد دیکھتا تھا۔ جلد جتنی شفاف، بے داغ، اُجلی، نرم، ملائم اور گداز ہوتی تھی اس کی محبت اتنی ہی شدت سے اُبھرتی تھی۔ خوب صورت جلد کو دیکھتے ہی اس کے ناخن بے تاب ہونے لگتے۔ زیرِ لب ہولے ہولے وہ دانت کٹکٹانے لگتا اور اس کے ذہن میں خیال آتا کہ جب اس حسین اور نازک جلد پر چابک کا پہلا وار پڑے گا، تو جلد پر کس سرعت سے وہ سُرخ داغ اُبھرے

گا جس کے تصوّر ہی سے اس کی روح اہتزاز کرنے لگتی تھی۔

رجنی کو بھی اُس نے اِسی وجہ سے چاہا تھا اور بڑی شدّت سے چاہا تھا۔ کیوں کہ رجنی کی جلد بے حد بے عیب، مکمل طور پر ملائم، تندرست اور بے داغ تھی۔ اس کے جسم پر کہیں کوئی داغ دھبّہ یا چتّی نہ تھی۔ دودھیا رنگ کی شفاف جلد کو ذرا سا دبانے سے ایسا محسوس ہوتا تھا، گویا بالائی کی کئی تہیں اس کے اندر دبائی گئی ہیں۔ اور دباؤ ہٹانے سے نازک جلد پر فوراً ایک گلابی دھبّہ سا اُبھر آتا تھا۔ وہ رجنی کو دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ اور ہر قیمت پر اُسے حاصل کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

رجنی بھی تھوڑے سے پس و پیش کے بعد تیار ہو گئی۔ کیونکہ وہ ایک بے حد بے وقوف لڑکی تھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس کا شوہر تین لاکھ روپوں کی خاطر کیوں اُسے چابک کی مار کھانے پر مجبور کر رہا ہے۔

”تین لاکھ رُوپے لے کر ہم کیا کریں گے؟“

”ہم ایک بہتر فلیٹ لیں گے۔“

”نہیں!“ رجنی نے بڑی مضبوطی سے سر ہلایا۔ ”ہم میاں بیوی کے لئے یہ دو کمروں کا فلیٹ کافی ہے۔“

”میں تمہارے لئے ایک شاندار گاڑی خریدوں گا جس میں بیٹھ کر تم اپنی سہیلیوں سے ملنے جا سکو گی۔“

”میری سب سہیلیاں ایسے ہی ملتی رہتی ہیں۔ مجھے ان کے گھر تک جانے کے لئے کسی

گاڑی کی ضرورت نہیں۔"

"میں تمہیں کشمیر کی سیر کراؤں گا۔"

"سیر تو میں یہاں جوہو پر بھی کر لیتی ہوں۔"

"کشمیر بہت خوب صورت ہے۔"

"سمندر بھی بہت خوب صورت ہے۔"

"میں تمہیں یورپ دکھاؤں گا۔"

"یورپ دیکھ کر میں کیا کروں گی؟ میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

"تم تو احمق ہو!" اُس کے شوہر نے جھنجلا کر کہا۔ "بات کو سمجھتی نہیں ہو۔ سُنو، جب تمہارے پاس ایک خوب صورت فلیٹ ہوگا۔ ایک خوبصورت گاڑی ہوگی۔ قیمتی زیورات اور لباس ہوں گے۔ تو تمہاری سہیلیاں تمہیں دیکھ کر جلیں گی۔"

"کسی کو جلانے کی خاطر میں چابک کی مار کیوں کھاؤں؟" رجنی نے بڑی معصومیت سے پُوچھا۔

"کیونکہ مجھے تین لاکھ روپے چاہئیں!" اُس کے شوہر نے بڑی سختی سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"کیوں چاہئیں؟" رجنی نے پھر پوچھا۔ "ہمارے پاس وہ سب کچھ ہے جو ہمیں چاہیئے تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ تم مہینے میں تین سو کما کے لاتے ہو، میں تین سو میں بڑی خوش اسلوبی سے گھر چلا لیتی ہوں۔ پھر اور کیا چاہیئے تمہیں؟" رجنی نے بڑی حیرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

"مجھے تین لاکھ چاہئیں۔ اپنا آزاد بزنس چاہیئے۔ میں ترقی کرنا چاہتا ہوں۔ آگے بڑھنا

چاہتا ہوں۔ میں اپنی موجودہ زندگی سے خوش نہیں ہوں۔ میں بہت بڑی خوشی چاہتا ہوں!"
وہ چلّا کر بولا۔

"اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہوگی؟" رجنی نے جھجھک کر کہا، مگر وہ اپنے شوہر کے کڑوے تیور دیکھ کر شوہر کی ہدایات پر عمل کرنے کے لئے مان گئی۔ کیونکہ وہ بڑی احمق اور بیوقوف لڑکی تھی۔

اور اب رجنی اس کی خواب گاہ میں تھی۔ اور ایک ایسے مہین شفاف لباس میں تھی، جس سے اس کا بدن ایک ایسی نازک بلوریں صراحی کی طرح نظر آتا تھا۔ جس میں گلابی بھری ہو۔

"تمہاری جلد بہت خوب صورت ہے۔" بادشاہ نے رجنی سے تعریفی لہجے میں کہا۔ "ایسی خوب صورت جلد اگر میرے ریان کے کارخانے میں بن سکتی۔ تو میں آج دنیا کا سب سے امیر آدمی ہوتا۔"

وہ ہنسی۔ بولی "میری ماں کی جلد مجھ سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔"

"تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"وہ تو مر چکی ہے۔" رجنی نے آہستہ سے کہا۔ اور ماں کی یاد سے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

بادشاہ کو اس بے وقوف لڑکی کی ادا بہت پسند آئی۔ اس نے ایک بلوریں جام بھر کر اس کے سامنے رکھا۔

"یہ کیا ہے؟" رجنی نے پوچھا۔

"شراب ہے۔"

کوّے نے زور سے کائیں کائیں کی، ظالم سنگھ چونک گیا۔ اس نے اپنے قریب سے ایک پتھر اُٹھا کر کوّے کی طرف زور سے مارا۔ کوّا کائیں کائیں کرتا ہوا اُڑ گیا۔ ظالم سنگھ خود بخود ہنس پڑا۔

شاید اُس کے گھر کی منڈیر پر کوئی کوّا اس وقت بیٹھا ہوا اس طرح کائیں کائیں کرتا ہوا، کرتارو کو آنے والے مہمان کی آمد کا سندیسہ دے رہا ہوگا۔ وہ تین سال کے بعد اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ اس نے کرتارو کو خط تو لکھ دیا تھا، اور اس وقت جس دھڑکتے ہوئے دل سے وہ کرتارو تک پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس دھڑکتے ہوئے دل سے اس کی پیاری بیوی بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

تین سال پہلے جب وہ کرتارو سے رخصت ہو کر گیا تھا، تو اُسی یوکلپٹس کے کنج تک اُس کی بیوی اُسے چھوڑنے کے لئے آئی تھی۔ اور جو وہ کپڑے اس وقت پہنے ہوئے تھی، اُنہیں کپڑوں میں ظالم سنگھ اس وقت کرتارو کو اپنے ذہن میں اُبھرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کرتارو کا بوٹا سا قد، سڈول، یوکلپٹس کی شاخوں کی طرح، اور پتلے تیکھے نازک نین نقش، اور نیلی ساٹن کی لمبی پھولدار قمیض میں اس کی کمر لچکتی ہوئی اور کولھے ڈولتے ہوئے ایکبارگی خون بڑے زور سے اس کی کنپٹیوں میں بجنے لگا۔ اس کی گونج اس کے کانوں میں اتنی بلند تھی گویا آس پاس کے پہاڑوں کی گھاٹیاں اور ڈھلانیں اور وادیاں اُس کے لہو کی گونج سے بھر گئی تھیں۔ وہ کرتارو تک پہنچنے کا انتظار بڑی مشکل سے کر سکتا تھا۔ حالانکہ گھر اب بہت دور نہ تھا۔ یوکلپٹس کے کنج سے پرے، آدھے کوس کے فاصلے پر ڈھکی کی اوٹ میں تھا۔ مگر وہاں تک پہنچنے کا انتظار کون کرے —— ؟ ایسے موقعوں کے لئے ہیلی کاپٹر ہونا چاہیئے۔ ہیلی کاپٹر کو اُڑاتے ہوئے وہ اُسے سیدھا اپنے گھر

کی چھت پر اُتار سکتا تھا۔ وہ فخریہ انداز سے، دونوں بازو پھیلا کر، کرتارو کو آواز دے سکتا تھا۔

"ماکھیوں میں آگیا"

وہ کرتارو کو پیار سے "ماکھیوں" کہتا تھا، جس کا مطلب پہاڑی زبان میں "شہد" ہوتا ہے۔ اس کی کرتارو واقعی شہد کی طرح میٹھی تھی، اور ایسی ہی نرم اور گھگھنے والی اور ایسی ہی سنہری رنگت والی۔ اس کی آواز سن کر، گھر کے آنگن میں کام کرنے والی کرتارو کیسے حیرت سے چونک جاتی؟ اور سر اٹھا کر اپنی بڑی بڑی، چشمے کی طرح چمکیلی آنکھوں سے ضرور اس کی طرف تکنے لگتی اور منہ سے کچھ بول نہ سکتی۔ اور وہ گھر کی چھت سے چھلانگ لگا کر نیچے آنگن میں کود پڑتا، اور کرتارو کو اپنے سینے سے لگا لیتا۔

لہو اتنے زور سے گونجنے لگا تھا، اور رخسار کسی اندرونی حدت سے یوں تمتماتے تھے، جیسے کسی نے تانبے کو آگ پر رکھ دیا ہو۔ ظالم سنگھ نے جلدی جلدی اوک میں پانی بھر کر، اپنے چہرے پر پھینکا۔ دو تین چار بار۔ جب چشمے کے برفیلے پانی کے لمس سے اس کا چہرہ پھر ٹھنڈا ہوا تو وہ یک دم چشمے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اور پلٹ کر اس نے چٹان سے ٹکی ہوئی رائفل کو اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ بستر کو اپنی پیٹھ پر پر لاد لیا، اور کالے ٹرنک کو اٹھا کر، جس میں اس کے کپڑے اور کرتارو اور چندن کے لئے تحفے بھرے ہوئے تھے، اپنے سر پر لاد لیا، اور پھر تیز تیز قدموں سے اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

راستے بھر وہ دعا کرتا رہا کہ راستے میں اسے کوئی نہ ملے۔ کرتارو کو دیکھنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں کے کسی آدمی سے نہ ملنا چاہتا تھا۔ وہ تین سال کے بعد اپنے گاؤں آرہا

تھا۔ اس لئے اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر راستے میں گاؤں کا ایک بھی آدمی مل گیا، تو وہ پہلے تو اُس سے پانچ منٹ تک بغل گیر ہوتا رہے گا۔ پھر کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اس کا حال چال پوچھتا رہے گا پھر لہکتی ہوئی بلند آواز میں کھیتوں میں کام کرتے ہوئے، اپنے دوسرے "گرائیوں" کو بلاوے پر بلاوے دے گا ــــ "او بسنتا سیٹھا! او محمد دینا! او قادرے! اوئے پھیرا رام! سرو دے پتر دیکھ کون آیا ہے......؟ اپنا گرائیں (گاؤں والا) صوبے دار بہجر ظالم سنگھ......!" نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہو کر بھی تین گھنٹے سے پہلے اپنے گھر نہ پہنچ سکے گا......کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟ کہ سارے گاؤں کے لوگ، اس کی کرتار و اور اس کے بھائی چندن سنگھ کے سوا، مر جائیں؛ چند لمحوں کے لئے۔ یا چلو سو جائیں؟ یا اندھے ہو جائیں؛ چند لمحوں کے لئے۔ بس چند منٹوں کے لئے......؟ اور جب اُس نے سوچا کہ ایسا کسی طرح نہیں ہو سکتا، تو اس نے چلتے چلتے اپنا راستہ بدل دیا۔

وہ تارس نالے میں گھس گیا، جو گاؤں کے [illegible]واڑے ڈھکی کے نیچے ایک خطرناک ڈھلان پر بہتا تھا۔ ڈھکی کے اوپر گاؤں تھا۔ گاؤں کے پرے دوسری طرف کی سرسبز ڈھلانوں پر کھیت تھے۔ مگر یہاں سے وہ کسی [illegible] دیکھ سکتا تھا۔ اور نہ کوئی اُسے دیکھ سکتا تھا کیونکہ گاؤں اوپر ڈھکی پر واقع تھا، [illegible] وہ تارس نالے کے کنارے کنارے جنگلی اخروٹوں کے گھنیرے سایوں میں چل رہا تھا، اور بڑی احتیاط سے قدم اُٹھا رہا تھا۔ کیونکہ ڈھلان بہت خطرناک تھی۔ اور یہاں سے گاؤں تک جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ مگر وہ ایک راستہ جانتا تھا۔ بچپن کا راستہ۔ عمودی اور پھسلواں چٹانوں سے گذرتا ہوا، ایک خطرناک راستہ۔ جسے صرف بکریاں استعمال کرتی تھیں۔ یا کبھی کبھی گاؤں

کے بچے سب کی نظروں سے چھپ کر، گرتے پڑتے، پھسلتے ہوئے تنیچے تار س نالے کے کنارے اخروٹوں کے جنگل میں پہنچ جاتے تھے۔ اور اخروٹ توڑ توڑ کر کھاتے تھے۔

یہ راستہ بالکل اس کے گھر کے پیچھے سے نکلتا تھا۔ اِس راستے پر چلتے ہوئے وہ گاؤں کے کسی آدمی کی نگاہ میں نہ آسکے گا۔ بلکہ خود کرتارو کو بھی بہت پہلے اُس کے آنے کی خبر نہ ہوگی۔ اور وہ صرف اس وقت اُسے دیکھ سکے گی جب وہ گھر کے دروازے پر کھڑا ہو کر آنگن میں آواز دے گا۔

"ماکھیوں!"

چلتے چلتے وہ یکایک سہم گیا اور رُک گیا۔ اس کے راستے میں دو نیلی چٹانوں کے درمیان اُگے ہوئے اخروٹ کے ایک پیڑ پر دو لڑکے بیٹھے تھے، اور اخروٹ توڑتے ہوئے رُک گئے تھے۔ اور حیرت سے اس کی شاندار وردی اور اس کی چمکتی ہوئی رائفل کو دیکھ رہے تھے۔ چند منٹوں میں یہ بچے بکریوں کی طرح اُچھلتے کودتے، چٹانوں کو پھلانگتے اوپر ڈھکی پر پہنچ جائیں گے اور چلا چلا کر اس کی آمد کا اعلان کر دیں گے۔

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے ان دونوں لڑکوں کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں تک وہ لڑکے اخروٹ کی شاخ پر جامد و ساکت بیٹھے رہے۔ پھر اُس کے چہرے کی خشونت دیکھ کر سہمے ہوئے نیچے اُتر آئے۔

ظالم سنگھ نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیلوفون کے ایک لفافے میں بھری ہوئی ٹافیاں نکالیں۔ یہ ٹافیاں وہ کرتارو کے لئے لایا تھا۔

چار ٹافیاں اُس نے ان لڑکوں کو دے کر کہا۔

"لو!"

لڑکے ہچکچائے۔

"لو!" اُس نے سختی سے کہا۔ "انگریزی مٹھائی ہے۔"

انگریزی مٹھائی کا نام سُن کر اُن دونوں لڑکوں کے ہاتھ بڑھ گئے۔

ظالم سنگھ نے ہاتھ سے رائفل کو جھلا کر کہا۔ "اگر تم نے کسی کو بتایا کہ ظالم سنگھ گاؤں میں آیا ہے، تو گولی مار دوں گا! سمجھ گئے!!"

خوف اور دہشت سے لڑکوں کی آنکھوں کی سفیدی پھیلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ مگر دہشت کے مارے، ان کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ ظالم سنگھ آگے بڑھ گیا۔ آگے جاتے جاتے مسکرانے لگا۔ اُسے معلوم تھا کہ اب ایک گھنٹے تک تو ان لڑکوں کی ہمت نہ ہوگی کہ اوپر ڈھکی پر جا سکیں اُسے معلوم تھا کہ لڑکے اب بھی اس اخروٹ کے پیڑ کے نیچے کھڑے اُسے تک رہے ہیں۔ مگر اس نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ ورنہ شاید دہشت کا تاثر ٹوٹ جاتا۔......... وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ اور بالکل اُس ڈھلوان پر جا پہنچا جس کے اوپر چڑھ کر وہ سیدھا اپنے گھر کے عقب میں پہنچ سکتا تھا۔

یہاں تقریباً کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا بہت مدت سے کسی نے اس راستے کو استعمال نہیں کیا ہے۔ یا بجور بستا رس نالے تک پہنچنے کا کوئی دوسرا آسان راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔

یہاں اُونچی نیچی چٹانیں تھیں۔ اور زمین بے حد پھسلواں تھی۔ جگہ جگہ سونفٹ کی جھاڑیاں تھیں۔ اور بیریوں کی جھاڑیاں، اودی بیریاں، لال بیریاں، چٹی بیریاں، اور بادام بیریاں، جن کا رنگ بادام کی طرح زردی مائل ہوتا ہے۔ لیکن جو مزے میں سب سے

میٹھی ہوتی ہیں۔ تین سال سے اُس نے بادام بیریاں نہ چکھی تھیں۔ تین سال سے وہ کرتارو کے ہونٹوں کی لذت سے ناواقف تھا۔ راستے پر اوپر چڑھتے چڑھتے بادام بیریاں چکھتے چکھتے کیوں اُس کے ذہن میں کرتارو بار بار آجاتی تھی۔ اور اس کی ہر سوچ میں گڈمڈ ہو جاتی تھی۔

اُس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔

چڑھائی کا آخری حصہ اُس نے بڑی مشکل سے طے کیا۔ یہاں فوجی مشق اس کے کام آئی تھی۔ بالکل آخر کی چٹان تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا، اس جگہ اور اوپر کی چٹان تک کے بیچ کے فاصلے میں صرف پونے گز کا فاصلہ تھا۔ لیکن وہ اوپر تک کیسے پہنچے؟ اس بوجھ کے ساتھ——؟

اس نے بڑی احتیاط سے اپنے دونوں ہاتھوں میں ٹرنک کو سر سے اٹھا کر اوپر کیا، اور دونوں بازو اور ایڑیاں اٹھا کر اپنے جسم کی پوری قوت سے ٹرنک کو اوپر کی چٹان پر دھکیل دیا۔ پھر ایک دم جست لگا کر جو وہ اچھلا تو اس کے دونوں بازو اوپر کی چٹان پر جم گئے۔ اور باقی کا جسم نیچے خلا میں لٹکنے لگا۔ اس نے زور لگا کر بندر کی طرح لہرا کر جو زقند لگائی تو ہاری زنٹل بار کی طرح چٹان کو استعمال کرتے ہوئے چوٹی کے اوپر پہنچ گیا۔

اوپر کودتے ہوئے لمبی لمبی گھاس نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ یہ گھاس اس کے گھر کے پچھواڑے میں اُگی ہوئی تھی۔ اس گھاس میں خورو بھنگ کے پودے اور پوست کے پودے، اور کہیں کہیں سونف کی جھاڑیاں اور لوکی کی بیلیں چھت سے زمین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان کے بڑے بڑے پتوں سے ایک عجب کڑوی سی مہک آتی تھی جو اُسے اس وقت بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ چند لمحوں تک وہ گھاس پر خاموشی

سے لپٹا رہا —— خاموشی —— گہرا سناٹا —— جیسے ساری کائنات سو رہی ہو، اور کرتارو اس کے چہرے پر جھکی دھیرے دھیرے سانس لے رہی ہو۔ گھبرا کر وہ اُٹھ بیٹھا۔ ٹرنک کو اُس نے پھر اپنے سر پر اٹھا لیا، اور دبے دبے قدموں سے چلتا، دیوار سے لگتا لگتا وہ اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ کھُلا تھا۔ اور کھُلے دروازے کے چوکھٹے میں دُور اندر برآمدے کے ایک کونے میں چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی کرتارو اُسے نظر آگئی۔ لیکن کرتارو اُسے نہ دیکھ سکی، کیونکہ اس کی پشت ظالم سنگھ کی طرف تھی۔ مگر وہ کرتارو کے اُلجھے ہوئے بال دیکھ سکتا تھا۔ اور لہراتی ہوئی چوٹی اور اودے رنگ پھولوں کی کاسنی شلوار اور قمیض اور اس کے بھرے بھرے ہاتھوں میں کہنیوں کے پاس سونے میں ترشے ہوئے گڈھے سے پڑتے ہوئے گویا اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے۔ اور اس نے ہونٹ دبا کر، بڑی احتیاط سے ٹرنک کو اپنے سر سے اتار کر، کوئی آواز پیدا کئے بغیر، دروازے کے اندر ایک کونے میں رکھ دیا، اور پھر بستر، اور پھر انتہائی ہوشیاری سے جھک کر دبے پاؤں برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔

مگر اس کے بوٹ فوجی تھے، اس لئے چند قدم چل کر ہی وہ آنگن کی مٹی میں دبے ہوئے کسی پتھر سے لگ کر بج اُٹھے۔ اور کرتارو نے چونک کر اور مڑ کر ایک لمحے کے لئے پیچھے دیکھا، اور پیچھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ یوں لال ہو گیا جیسے اکدم شفق کے سُرخ بادلوں نے اس کے چہرے پر اپنی رنگین چلمن ڈال دی ہو۔ وہ بیٹھی بیٹھی اور جھُک گئی۔ اور منہ موڑ کر اُس نے اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپا لیا۔

دو تین لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ظالم سنگھ نے کرتارو کو جا لیا۔ اور اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور کرتارو کا دم رُکنے لگا، اور منہ بیا

میں چلانے والی ڈوئی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اور وہ اپنے خاوند کے سینے سے لگی لگی سسکنے لگی۔

بہت سا وقت گذرنے کے بعد جب ظالم سنگھ کے سینے کی دھمک کسی قدر کم ہوئی تو اس نے اُسی طرح صحن میں کھڑے کھڑے کرتارو کو اپنے سینے سے چمٹائے سوال کیا۔

"چندن کہاں ہے؟"

ظالم سنگھ کو اب اپنے بھائی کی یاد آئی تھی۔

جواب میں کرتارو کچھ نہیں بولی۔ صرف ظالم سنگھ نے اتنا محسوس کیا جیسے کرتارو کا جسم ایک بار زور سے لرز کر کانپا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں برف کی طرح ٹھنڈا ہوگیا۔

"بات کیا ہے؟ بولتی کیوں نہیں ہو؟ چندن سنگھ کہاں ہے؟"—ظالم سنگھ نے کرتارو کو اپنے سینے سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

لیکن کرتارو اس کے سینے سے نہیں ہٹی، اور بھی زور سے چمٹ گئی اور منہ چھپا کر بلکنے لگی۔

"بات کیا ہے کرتارو!؟ بتاتی کیوں نہیں ہو!؟ کیا چندن سنگھ مر گیا ہے؟"

کوئی جواب دیئے بغیر کرتارو نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا۔

"پھر کیا کسی دوسرے گاؤں گیا ہے؟"

کرتارو نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

"پھر کہاں ہے وہ!؟" ظالم سنگھ نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"تمہارے آنے کی خبر سُن کر بھاگ گیا ہے۔" کرتارو سسکیوں کے درمیان بولی

اب اُس کی پتلی پتلی گلابی انگلیاں ظالم سنگھ کے سینے کو ٹٹول رہی تھیں۔

"بھاگ گیا ہے؟ کیوں؟" ظالم سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ چندن سنگھ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ اس لئے ظالم سنگھ چندن سنگھ کو اپنا بھائی ہی نہیں، اپنا بیٹا بھی سمجھتا تھا۔ بڑے لاڈ اور چاؤ سے اس نے چندن سنگھ کی پرورش کی تھی۔ اور دونوں بھائیوں میں بے حد پیار تھا۔ اس لئے ظالم سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کرتارو کیا کہہ رہی ہے۔

کرتارو کا چہرہ سرک کر اوپر اُٹھا اور اس کے کان تک پہنچ گیا۔ کرتارو کے ہونٹ اُس کے کان کی لَو سے جا لگے۔ اور اس کی گرم گرم سانس کی بھاپ ظالم سنگھ کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ کرتارو دھیرے دھیرے سسکیوں کے درمیان ظالم سنگھ کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد ظالم سنگھ نے کرتارو کو یوں اپنی گود سے گرا دیا، جیسے اب تک وہ کسی سانپ کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کرتارو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا خون اندر ہی اندر برف کی طرح منجمد ہونے لگا۔ اس کا گلا رُکنے لگا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے زخموں میں برف کا ڈلا رکھ دیا ہو۔

یکایک وہ چیخ کر بولا — "سچ کہتی ہو!؟ کیا واقعی سچ کہتی ہو!؟"

کرتارو اس کے بازوؤں سے گر کر زمین پر لیٹی تھی۔ دو تین بار اس نے بے بسی اور مجبوری میں اپنی بانہوں کو جنبش دی اور اسی طرح زمین پر گری سسک سسک کر رونے لگی۔ مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔

یکایک ظالم سنگھ نے اپنی رائفل کو زور سے پکڑ لیا۔ پھر اس نے ہاتھ کے ایک

ہی جھٹکے سے کرتارو کو اُٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ اور برآمدے کی دیوار سے لگی ایک کدالی کو اُٹھا کر کرتارو کے ہاتھ میں دے کر بولا ——— "چل میرے ساتھ!"

کرتارو وحشت ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ——— "کہاں جا رہے ہو؟"

"زیادہ بکواس نہ کر! میرے پیچھے پیچھے چلی آ!" ظالم سنگھ گرج کر بولا۔

اتنا کہہ کر وہ گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ کانپتی ہوئی کرتارو بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

مغربی ڈھلوان پر چند بکریاں چر رہی تھیں۔ اور ایک کُتا ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ ظالم سنگھ نے پہچان لیا۔ یہ اس کا ڈبو کتا تھا۔

"ڈبو!" ظالم سنگھ نے زور سے اُسے پکارا۔

ڈبو اپنے مالک کو پہچان کر تیر کی سی تیزی سے بھاگا۔ اور بھاگتے بھاگتے آخری جست میں جو اُچھلا تو ظالم سنگھ کے کاندھوں پر۔ مگر ظالم سنگھ نے اُسے صرف ایک لمحے کے لیے اپنے کندھے پر رہنے دیا۔ پھر ڈبو کو ہٹا کر کرتارو سے کہنے لگا۔

"چندن سنگھ کا کوئی کپڑا گھر پر ہو تو کتے کو سنگھانے کے لئے لے کر آؤ ویسے میں جانتا ہوں کہ وہ بھاگ کے کہاں گیا ہوگا۔ مگر اپنا کتا بھی مدد کر سکتا ہے۔ ڈبو بڑا ہوشیار ہے ——— "

دن بھر وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں چلتے رہے۔ کرتارو بار بار تھک جاتی اور بار

بار ظالم سنگھ کو اپنی کمزور آواز میں، کمزور اور مجبور سے لہجے میں کچھ اس طرح واپس گھر جانے کے لئے کہتی کہ ظالم سنگھ کا غصّہ دونا ہو جاتا، اور وہ بڑی سختی سے اُسے ڈانٹ دیتا۔ اور آگے بڑھ جاتا۔ ڈبو نے بھی دُم پالی تھی۔ اور اب بڑی خوشی سے آگے آگے جھاڑیوں کے گرد گھومتا ہوا، درختوں کے تنوں کو اور راستے میں آنے والی چٹانوں کے گرد اُگی ہوئی گھاس کو سونگھتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک تھی۔ جیسے وہ اپنے پیارے چندن سے ملنے جا رہا ہو۔ ڈبو چندن سے بڑی محبت کرتا تھا۔ اور جلد سے جلد اُس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

"وہیں گیا ہے۔" آگے آگے تیزی سے دوڑنے والے ڈبو کے راستے کی سمت دیکھ کر ظالم سنگھ نے اندازہ کیا۔ ایک بار ظالم سنگھ نے چندن سنگھ کو اس کے لڑکپن میں مارا تھا۔ اور مار کھا کر چندن سنگھ ڈر کے مارے گاؤں سے باہر بھاگ گیا تھا۔ اور چیڑھ کے جنگلوں کے اوپر شاہ پیر کی چوٹی پر چلا گیا تھا۔ اس چوٹی پر لاکھوں برسوں کی برف نے گھل گھل کر کچھ چٹانوں کو ننگا کر دیا تھا۔ اور کچھ چٹانوں کے اندر دراڑیں ڈال ڈال کر اُن میں عجیب و غریب محرابیں سی بنا ڈالی تھیں۔ اور ایک بہت بڑا غار جہاں بارش اور برف باری کے طوفانوں میں اچانک گھر جانے والے چرواہے اپنے گلے سمیت پناہ لیتے تھے۔ دو دن تک ڈھونڈنے کے بعد ظالم سنگھ نے چندن سنگھ کو اُسی غار میں پا لیا تھا۔ اس کے بعد بھی جب ظالم سنگھ کی کسی بات پر چندن سنگھ سے لڑائی ہوتی تھی۔ چندن سنگھ روٹھ کر اُسی غار میں جا کے پناہ لیتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اس کا بھائی وہیں اُسے منا کر لے جانے کے لئے آئے گا۔

* * *

سہ پہر کے قریب وہ شاہ پیر کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ بے حد خوب صورت تھی۔ دُور دُور میلوں تک کہستانی سلسلے اُٹھتے گرتے اُفقوں کو چومتے نظر آتے تھے۔ چٹانوں کی محرابیں ایسی خوب صورتی سے ترشی ہوئی تھیں گویا برف کے ہاتھوں نے نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں نے انہیں تعمیر کیا ہو۔ مگر ظالم سنگھ کی آنکھیں اس وقت کسی خوب صورتی کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔

ایک محراب کے قریب پہنچ کر ڈبو زور سے بھونکنے لگا۔

ظالم سنگھ نے اپنے کندھے سے رائفل اتاری۔

"کیا کرتے ہو! کیا کرتے ہو؟" کرتارو نے سسک کر کہا "وہ تمہارا بھائی ہے۔ چندن!"

"مگر اس نے میری عزت پر ڈاکہ ڈالا ہے!" اتنا کہہ کر ظالم سنگھ نے کرتارو کو دھکا دیا، اور اپنا دامن چھڑا کر کتے کے پیچھے بھاگنے لگا۔

کتے کی آواز اور قدموں کی چاپ سن کر ایک آدمی محراب کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کی نگاہوں میں سہ پہر کا سورج تھا۔ ماتھا فراخ تھا۔ آنکھیں کنول کی طرح کھلی ہوئی کوئی بیس برس کا نوجوان۔ ظالم سنگھ کی طرح اونچا پورا قد۔ مگر ظالم سنگھ کی طرح مضبوط نہیں بلکہ دُبلا اور کسی حد تک نازک۔ اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بھی ایک عجیب سا لوچ تھا۔ اور شاعری جیسے اس کے انگ انگ میں گھلی ہوئی تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھا۔ اور اس کی خوب صورتی، جس پر کبھی ظالم سنگھ کو ناز تھا۔ اس وقت ظالم سنگھ کو ایک طمانچے کی طرح محسوس ہوئی۔ اُس نے رائفل سیدھی کرلی۔

"بھیا!" دونوں بازو کھول کر چندن چلایا۔

"وہیں کھڑے رہو!" ظالم سنگھ نے کڑک کر کہا اور شست باندھی۔

"بھیا میری تو سنو"

مگر چندن کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ظالم سنگھ نے اس کے دل میں گولی داغ دی تھی۔ ایک لمحے کے لیے چندن پتھروں کی نیلی محراب تلے جامد و ساکت کھڑا رہا۔ پھر چکرا کر نیچے گر پڑا اور پتھر کی ایک سل پر ٹھنڈا ہو گیا۔

رائفل کی آواز دُور دُور تک پہاڑوں میں گرجی۔ جیسے باری باری مختلف سمتوں سے رائفلیں چل رہی ہوں۔ دور اوپر آسمان میں کوئی چیل چلائی۔ پھر چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔

ظالم سنگھ کرتارو کی طرف مڑا۔

کرتارو اپنا فق چہرہ لئے کھڑی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں وحشت جھانک رہی تھی۔ اور ہونٹ ایسے بے رنگ تھے، جیسے کسی نے ان کا سارا لہو چوس لیا ہو۔

ظالم سنگھ نے اس کے ہاتھ سے کدال چھین کر کہا۔ "میں نیچے کوئی محفوظ کھڈ دیکھتا ہوں اُسے گاڑنے کے لیے۔ جب تک تم اس لاش کو دیکھتی رہو۔"

کرتارو کچھ نہیں بولی۔ اب نہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو تھا۔ نہ اس کے ہونٹوں پر ایک لفظ۔ وہ خاموش وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ اور جب ظالم سنگھ کدال ہاتھ میں لئے، چٹانوں پر پھلانگتا ہوا، دور کہیں نیچے چلا گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو وہ آہستہ آہستہ، ڈرتی ڈرتی، لاش کے پاس آئی۔ دیر تک اُسے گھورتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کے فق چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی اور وہ دھیرے

سے طنز آمیز لہجے میں بولی۔

"مجھے ٹھکرا کر اُس موئی سوتری سے محبت کرنے چلے تھے؟ — کیوں!؟"

پھر وہ تھوڑا سا جھکی، پھر بے بس ہو کر چندن کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اُس نے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے بے اختیار ہو کر چندن کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ دیوانہ وار اُس کے ہونٹوں کو چومنے لگی اور کہنے لگی۔

"مگر اب تم کسی کے پاس نہیں جا سکتے۔ اب تم میرے ہو گئے ہو۔ ہمیشہ کے لئے میرے چندن ہار!"

❖ ❖ ❖

قدسیہ پارک کا احمق

رات کو میں نے سپنا دیکھا۔ ایک بہت بڑی مورتی ہے، اس کی شکل تو صاف نظر نہیں آتی کیونکہ اس کے انگ انگ سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ وہ مورتی میرے قریب آ رہی ہے۔ اور قریب آتی ہے، اور جب وہ بالکل ہی قریب آگئی تو اس کے نور نے میری آنکھوں کو چُندھیا دیا۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس مورتی نے ہاتھ بڑھا کے میرے ماتھے کو چھو لیا اور بڑی میٹھی آواز میں بولی!

"جا بیٹا ہم نے تیری سُن لی۔ اب دُنیا کو تیرے درسِ حیات کی ضرورت ہے، نہیں تو یہ دُنیا تباہ ہو جائے گی — اس لئے بیٹا — جا — گھر سے نکل اور بھگوان کے پانچ نیک بندے ڈھونڈ لے اور ان پر اپنے عرفان اور گیان کا بھید کھول دے اور اُن کی مدد سے اس دُنیا کو بدل دے۔"

اس کے فوراً بعد ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنے آپ کو تیس ہزاری کے ایک تاریک چھپّر میں ایک جھلنگے پر لیٹا ہوا پایا۔ طاق میں دیئے کی لَو لرز رہی تھی۔ اور ایک کونے کی کھٹیا پر مجھے اپنی ستر برس کی بڈھی ماں کا پژمردہ نحیف اور زرد چہرہ ایک سُوکھی ہوئی ممّی کی طرح نظر آیا۔ میرا سارا بدن کسی انجانے خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں اپنی جھلنگی چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھ کر اُٹھا اور قریب کے ڈھکے ہوئے کٹورے سے مُنہ لگا کر غٹاغٹ پانی پیا — پانی پینے سے جب طبیعت کچھ بحال ہوئی تو کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گیا۔ کل صبح ہی مجھے خدا کے پانچ نیک بندوں کی تلاش میں نکل جانا ہوگا۔ دلی اتنا بڑا شہر ہے۔ اس میں خدا کے پانچ نیک بندوں کو — صرف پانچ نیک بندوں کو ڈھونڈ نکالنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ لیکن مجھے کیا کہنا ہوگا اُن سے؟ اس بات پر مجھے ابھی سے غور کر لینا چاہیئے — کیونکہ اب سوچ کا وقت گزر چکا — اب عمل کا وقت آیا ہے — میں دِلّی کے ایک چھوٹے سے پریس میں ایک معمولی پروف ریڈر ہوں۔ دن بھر دنیا کے بڑے بڑے عالموں کی کتابوں کے پروف درست کرتا ہوں۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ان بڑے بڑے عالموں کی کتابوں کو بالائے طاق رکھ کر دُنیا کی کھلی کتاب کے پروف ٹھیک کر دیئے جائیں۔ بھگوان نے مجھے اس کام کے لئے چُنا ہے — یہ میری خوش قسمتی ہے!

میں رات کے باقی حِصّہ میں اپنے "پیغام" پر غور کرتا رہا۔ پانچ چھ ورق کالے کئے لئے میں صبح ہوگئی۔ ماں نے اُٹھ کر رات کی بچی ہوئی دو روٹیاں میرے سامنے رکھیں۔ اور باسی دال — میں نے ایک چپاتی دال کے ساتھ کھالی۔ دوسری کو کاغذ میں لپیٹ لیا۔ پھر چھپّر کی چھت سے بانس کا ایک ڈنڈا نکالا اور چاقو لے کر اس کے ایک سرے

کو چھیڑنے لگا۔

"اے یہ کیا کرتا ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"میں دُنیا کو بدلنے جا رہا ہوں۔" میں نے اُسے بتایا۔

"پہلے اپنے کپڑے تو بدل لے!" ماں نے میری میلی کچیلی پھٹی ہوئی قمیض کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اُس نے بڑے پیار سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور اکدم چونک گئی۔

"ارے تیرا ماتھا تو آگ کی طرح گرم ہے۔" وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔

"یہ آگ نہیں ہے، بھگوان کا نور ہے۔" میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا اور اُسے رات کا سپنا سنا دیا۔

سپنا سن کر وہ میرے راستے میں کھڑی ہو گئی — گھبرا کر بولی — "میں تجھے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ باؤلا ہوا ہے کیا؟ چل ہاتھ منہ دھو، کپڑے بدل اور پریس میں جا —!"

مگر میں نے بانس کا ڈنڈا اٹھایا۔ ماں گھبرا کر پرے ہو گئی۔ میں چھپر کے دروازے سے نکل گیا۔

سب سے پہلے میں پارلیمنٹ ہاؤس گیا۔

جہاں سُنا ہے کہ خدا کے سبھی نیک بندے رہتے ہیں مگر وہاں کسی نے میری بات نہیں سنی۔ کسی کو فرصت ہی نہیں تھی۔ وزیر، ڈپٹی وزیر، چیف سیکریٹری، سیکریٹری راج سبھا کے ممبر، لوک سبھا کے ممبر سبھی اپنے اپنے کاموں اور کاموں سے زیادہ سازشوں

میں مصروف نظر آئے۔ کسی نے دھیان دے کر بات سننا تو کجا، میری طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا تک نہیں ـــــ میلوں لمبی غلام گردشوں میں حبس میں چلتے چلتے بیدم ہونے لگا اور بھوک اور پیاس سے بے حال ہونے لگا تو سستانے کے لئے ایک خالی کمرے میں گھس گیا جو کسی بڑے آدمی کا آفس معلوم ہوتا تھا۔ کمرے میں دبیز غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ اور پنکھا چل رہا تھا اور فوم ربڑ کی گدّے دار آرام کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے چپل اتار کر ایک کونے میں رکھی ـــــ بانس کے ڈنڈے کو دیوار سے ٹکایا اور ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر آرام اور سکون کے سانس لینے لگا۔ اتنے میں دروازے پر مجھے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور پھر گفت گو کی آواز ـــــ کوئی کسی سے کہہ رہا تھا! "پٹنہ سے آپ کے چچا کا خط لایا ہوں ـــ وہ بولے! تو سیدھا دِلّی میں میرے بھتیجے کے پاس چلا جا وہ تو بھگوان کا نیک بندہ ہے۔ آج تک میں نے اُسے جو کہا ہو اور اُس نے مجھے ٹالا ہو، ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ بس اُسی وقت وہ خط لے کر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سیدھا آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔ اب میری قسمت اور عزت دونوں آپ کے ہاتھ میں ہیں"

جواب میں شہد بھری آواز آئی۔ "اجی میں کس لائق ہوں جو کچھ میں کرتا ہوں لوگوں کے بھلے کے لئے کرتا ہوں، بس یہی میری زندگی کا مقصد ہے ـــــ آپ کل آئیے میں سب سے کہہ سُن رکھوں گا۔ آپ کا کام ہو جائے گا"

جواب میں پھر پہلے آدمی کی گھگھیاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ شکریہ کے چند بول ادا کر کے وہ رخصت ہوا اور وہ بھگوان کا نیک بندہ کمرے میں آیا تو میں اُسے دیکھ کر باغ باغ ہوا۔ سپید کھدّر میں ملبوس، سر پہ گاندھی ٹوپی، چہرے پہ نیکی کا جلال،

آتے ہی اپنی کرسی پر بیٹھ کر کسی وزیر کو ٹیلی فون کرنے لگا۔ اور جب ٹیلی فون سے فارغ ہوا تو اچانک اُس کی نظر مجھ پر پڑی، دیکھتے ہی بھونچکا ہو گیا فوراً اپنی کرسی سے اُٹھ کر میرے پاس آیا اور بولا "تم کون ہو؟"

میں نے اس کے قریب جا کر سرگوشی میں کہا — "ایک پیغام لایا ہوں آپ کے لئے —"

"کس کا؟"

"بھگوان کا۔"

نام سنتے ہی اس کے چہرہ کی رونق دوبالا ہو گئی۔ نور اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگا۔ چہرے کی مسکراہٹ بڑھ گئی — کمال مہربانی سے مجھے میری کرسی پر واپس بٹھاتے ہوئے بولا — اچھا اچھا — میں سمجھ گیا — بھگوان سنگھ کیمسٹ کا پیغام لائے ہو۔ وہی جس کا کوٹہ میں نے بڑھوا دیا تھا۔"

"جی نہیں" — میں نے بڑی مضبوطی سے اپنے بانس کے ڈنڈے کو تھامتے ہوئے کہا — میں بھگوان سنگھ کیمسٹ کی طرف سے نہیں آیا ہوں۔ میں تو اُس کی طرف سے آیا ہوں جو سب کا بھگوان ہے۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے کی مسکراہٹ، آنکھوں کا نور، رخساروں کی لالی سب یکدم غائب ہو گئی — ہونٹوں کے کونے پھڑکنے لگے۔ اُس نے زور سے ہتھیلی مار کر تین چار بار گھنٹی بجائی — گھنٹی کی آواز سنتے ہی دو چپراسی بھاگے بھاگے اندر آئے۔ اُس بھلے مانس نے میری طرف اشارہ کر کے بڑی سختی سے کہا۔

"اسے باہر نکال دو۔"

ایک چپڑاسی نے میری دائیں بغل میں ہاتھ دیا اور دوسرے نے بائیں میں۔ تیسرے لمحے میں یہ خاکسار کمرے کے باہر فرش پر پڑا تھا۔

دن بھر کناٹ پلیس میں گھومتا رہا۔ سینکڑوں دوکانیں، ہزاروں لوگ، لاکھوں کی خرید و فروخت۔ دن بھر جھپک کر پڑھتا رہا۔ کہیں وہ روشنی نظر نہ آئی جسے بھگوان کے نور کا عکس ہی کہہ سکتا۔ ہر شخص اپنی ہی غرض کا بندہ اپنی ہی کسی چھوٹی سی خواہش کی ڈوری سے بندھا ایک پتلی کی طرح چل رہا تھا، دوکان میں گھس رہا تھا، دوکان سے باہر آرہا تھا، بنڈل بنا رہا تھا، بنڈل لے رہا تھا۔ بٹوا کھول رہا تھا، تجوری میں رکھ رہا تھا۔ کتنی ہی ننھی ننھی ڈوریوں سے ناچتی ہوئی پتلیاں تھیں۔

سہ پہر کے قریب جن پتھ پر ایک آدمی نظر آیا۔ وہ ایک ساڑھی خریدنے والی عورت سے کہہ رہا تھا۔ "یقین نہ آئے تو بازار میں بھاؤ پوچھ لیجئے۔ یہ ہانگ پرنٹ کی ساڑھی ہے۔ اس کوالٹی کی ساڑھی آپ کو کہیں پچپن روپے سے کم میں نہ ملے گی۔ میں جو پنتالیس روپے میں دے رہا ہوں۔ وہ تو میں آپ کو اپنا مستقل گاہک بنانے کے لئے دس روپے کا نقصان اٹھا رہا ہوں۔ ورنہ ——

بس دو پیسے کمانا اور گاہک کی سیوا کرنا، یہی میرا دھرم ہے۔"

اُس شریف دوکاندار نے دس روپے کا نقصان اُٹھا کر وہ ساڑھی اس عورت کو دے دی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اگلے آدھے گھنٹے میں اُس نے اسی طرح پانچ اور سات روپے کا نقصان اُٹھا کر ایک قمیض اور دو شلوار کے کپڑے دو اور خریداروں

کو فروخت کر دیئے۔ وہ ایک نوجوان اور خوبصورت بیوپاری تھا — ماتھے پر تلک، کمر پر سفید دھوتی، گردن میں گیتا کا لاکٹ اور ہاتھ کے انگوٹھے پر ادم کھدا ہوا تھا۔ میں نے سوچا پیشتر اس کے کہ کوئی اور گاہک آئے اور یہ خدا کا نیک بندہ مزید نقصان اٹھائے، میں اسے بھگوان کا پیغام دیدوں۔ چناں چہ یہی سوچ کر میں سیدھا دوکان کے اندر چلا گیا — مجھے دیکھ کر اس بیوپاری نے اپنی مسکراہٹ کو کسی حد تک سمیٹ لیا۔ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بولا!

"شرٹ کا کپڑا؟"

"نہیں۔"

"پائجامہ کا لٹھا؟"

"نہیں۔"

"ریڈی میڈ خاکی پتلون؟"

"نہیں" — میں نے اس کے قریب جا کر کہا — "آپ کے لئے ایک پیغام لایا ہوں۔"

"اوہو!" جیسے وہ سنتے ہی میری بات سمجھ گیا ہو۔ مجھے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا — "سمجھ گیا! لالہ کوڑے شاہ کے گھر سے آئے ہو۔ لڑکی کا پیغام لیکر۔"

"نہیں" — میں نے اسے بتایا — "میں تو بھگوان کا پیغام لے کر آیا ہوں!"

تو پھر —

اُس نے بھی میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس سے پہلے دو چپڑاسیوں نے کیا تھا۔

ساری جگہیں چھان ماریں — نئی دلّی، پرانی دِلّی، چاندنی چوک، جامع مسجد قطب صاحب کی لاٹ، قرول باغ کا بازار، برلا مندر، کہیں وہ صورت نظر نہ آئی جو مجھے اُمید بندھاتی۔ حیران ہو کر تھکا ہارا آخر گھر لوٹ آیا، دال روٹی کھا کر سو گیا اور صبح اُٹھ کر پھر ناشتہ میں ایک روٹی رات کی باسی کھا کر اور دوسری کاغذ میں لپیٹ کر اپنی تلاش میں رخصت ہوا۔ ماں کا چہرہ زرد تھا مگر اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ مجھ سے کچھ کہے سُنے۔

آج میں بہت جلدی صبح ہی میں نکل گیا۔ ہاتھ میں بانس کا ڈنڈا اور بغل میں باسی روٹی دبائے نئی کچہریوں سے سر جھکائے گذر گیا۔ چلتے چلتے کشمیری گیٹ کے باہر کی سبز ٹکوروں کے قریب پہونچا۔ جسے لوگ قدسیہ پارک کہتے ہیں۔ میں پھاٹک کھلا دیکھ کر اس کے اندر چلا گیا۔

اندر جاتے ہی مجھے ایک بوڑھا آدمی ملا۔ ایک ملگجی قمیض اور ملگجی تہمد پہنے ہوئے، سر جھکائے، ہاتھ میں آٹے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی اُٹھائے، باغ کی روش سے گزرتا جاتا تھا اور روش کے قریب گھاس کے قطع کو غور سے دیکھتا جاتا تھا اور جہاں جہاں چیونٹیوں کے سوراخ ملتے وہاں وہاں آٹا ڈالتا جاتا تھا۔ میں نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ خدا کا نیک بندہ ہے — چیونٹیوں کو آٹا ڈالتا ہے — میں نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

”بھگوان کے درشن کرو گے؟“ میں نے اُس سے پوچھا!

اُس نے مجھے دیکھ کر اپنی کمر سیدھی کی ——بولا "! کون ہے جو اس دنیا میں بھگوان کے درشن کرنا نہیں چاہتا؟"

"تو سیدھے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

"کہاں ؟"

میں نے قدسیہ پارک کے بیچوں بیچ امپیریل پام سے گھرے ہوئے چوک کی طرف اشارہ کر کے کہا ——"وہاں آجاؤ —— میں تمہیں بھگوان کا پیغام دوں گا۔"

اُس نے کہا —— "چیونٹیوں کو آٹا ڈال کے آتا ہوں —— ابھی!"

میں خوش وخرم آگے بڑھ گیا —— چلئے خدا کا ایک نیک بندہ تو ملا۔ ایک جھاڑی کے نیچے مجھے ایک ادھیڑ عمر کا ایک آدمی نظر آیا۔ کہ آلتی پالتی مارے دم سادھے، سانس چڑھائے پرانا یام کر رہا تھا —— چند منٹ کے بعد جب اُس نے اپنا پرانا یام ختم کیا تو میں اس سے مخاطب ہوا۔

"ایسا کیوں کرتے ہو؟ میں نے اس سے پوچھا!

وہ بولا! "جب سانس اوپر مستک میں جاتا ہے تو اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا —— "پرانا یام کے بغیر اس کا جلوہ دیکھنا چاہتے ہو تو میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

"کہاں ؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے قدسیہ پارک کے مرکزی چوک کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بولا —— "پرانا یام کی دوسری ورزش ختم کر لوں تو آتا ہوں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا!

وہ بولا۔" اس سے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں باغ کی کھلی صاف ہوا بدن میں جاتی ہے ۔۔۔"

میں نے کہا۔" دن میں ساڑھے تئیس گھنٹے شہر کی گندی ہوا کھانے کے بعد صرف دس پندرہ منٹ صاف ہوا کھانے سے پھیپھڑے کیسے مضبوط ہو سکتے ہیں؟ ہو سکے تو سارے شہر کی ہوا کو صاف کرو۔"

"خیر، تم چلو، میں آتا ہوں" ۔۔۔۔ وہ پرانا یام کی دوسری ورزش میں مصروف ہو گیا۔

آگے بڑھا تو ایک نوجوان نظر آیا۔ جو ہاتھ میں ایک چاقو لیئے امپریل پام کے تنوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے بھی آگے بڑھ کر غور سے دیکھا۔ پام کے مدور تنوں کی گہری موٹی چھال پر ان گنت نام کھدے ہوئے تھے ۔۔۔ رام رتن شرما، نیکی رام بھلہ، عبد الستار، منوہر سنگھ، گوری دت، شیخ عبد الغفور، پی جوزف، غلام محمد۔

"ہا!" وہ نوجوان چلّایا ۔۔۔۔ اور ایک نام پڑھ کر اس نے چاقو اٹھا کر درخت کے پر وار کیا ۔۔۔۔

"یہ کیا کرتے ہو، کیا کرتے ہو؟" میں نے چلا کر کہا!

وہ بولا ۔۔۔ "مسلمانوں کے نام کاٹتا ہوں۔"

"کیوں؟"

وہ بولا۔" میں نے قسم کھا رکھی ہے، قدسیہ پارک کے درختوں سے ایک ایک مسلمان کا نام کاٹ دوں گا۔"

وہ درخت کی چھال پر چاقو چلانے لگا۔ غلام محمد کا غلام کٹ گیا تھا محمد رہ گیا تھا۔

میں نے کہا! "رکو میرے بھائی اور سنو!"

وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا— "سنو، نئی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ساڑھے ستائیس فیصدی کے حساب سے بڑھ گئی ہے، ساڑھے تین کروڑ سے ساڑھے چار کروڑ کے قریب پہونچ گئی ہے۔ ان میں سے کس کس کو کاٹو گے اور کیسے تمہارا چاقو ان سب پر چلے گا؟"

وہ بولا— "مگر میں نے بھگوان کی قسم کھا رکھی ہے۔"

"بھگوان کے نیک بندے! بھگوان کو دیکھنا چاہتے ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا!

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو چاقو کا پھل تہ کرو اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ!"

"کہاں؟"

چوک کے مرکز میں جہاں باغ کی ساری روشیں آکے ملتی ہیں۔

وہ بولا۔ "ذرا یہ دو نام اور کاٹ لوں تو پھر آتا ہوں۔"

چوک کے مرکز میں پکّے چبوترے پر ایک نوجوان آدمی کمر تک دھوتی باندھے اور کمر سے اوپر صرف ایک جینو پہنے، ماتھے پر چندن کا لمبا تلک لگائے اس طرف مُنہ کئے بیٹھا تھا۔ جدھر جمنا جی سے نہا دھو کر آنے والے یاتریوں کا تانتا لگا ہوا تھا اور جو اشنان کے بعد قدسیہ پارک کی روشوں کو کاٹتے ہوئے موری گیٹ یا سبزی

منڈی کی جانب چلے جا رہے تھے ــــ یہ لوگ قدسیہ پارک کو ایک شارٹ کٹ کی طرح استعمال کرتے تھے۔ یہ نوجوان لمبا، سوکھا، سانولا، چوکڑی مارے بیٹھا تھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا "بھج من رام ہرے، بھج من رام ہرے"

میں کافی دیر تک اس کے پاس کھڑا رہا مگر جب بہت دیر تک اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی تو چند قدم آگے بڑھ کر، بالکل اس کے سر پر کھڑے ہو کر کہا۔

"بچہ، بھگوان کے درشن کر وگے؟"

اس نوجوان نے اپنی آنکھیں کھولیں ــــ میری طرف دیکھا ــــ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بڑی لاپروائی سے بولا "میرے دل میں اب کوئی خواہش نہیں رہی، بھگوان کو دیکھنے کی خواہش بھی نہیں رہی اب میں ہر طرح کی خواہش سے آزاد ہو چکا ہوں۔ بھج من رام ہرے، بھج من رام ہرے......"

وہ بولتے ہوئے آنکھیں بند کئے بڑبڑانے لگا اور میں چبوترے کے دوسرے کونے کی جانب چلا گیا جہاں دو بڈھے پنشن یافتہ بڑے انہماک سے ایک دوسرے سے، ادبیت فلاسفی پر گفت گو کر رہے تھے۔ فلسفہ کے بیچ بیچ میں کچھ اس قسم کی گفت گو بھی ہو جاتی ــــ

"اجی میں نے تو اس دُنیا سے دل ہی ہٹا لیا ہے۔ سارا کاروبار بیٹوں کے سپرد کر دیا ہے۔ لڑکیوں کی شادی کر دی ہے۔ بھگوان کی کرپا سے میری ایلومونیم کی فیکٹری کو اسی سال گورنمنٹ سے ساٹھ لاکھ کی سپلائی کا ٹھیکہ ملا ہے۔ دو فیکٹریاں اور فرید آباد میں چالو کر دی ہیں۔ ایک کوٹھی شملہ میں ہے، ایک ڈیرہ دون میں۔ ایک نئی دِلّی میں۔ سب سے چھوٹا لڑکا ولایت پڑھنے گیا ہے۔ مگر میں نے اب دُنیا سے دل

ہٹالیا ہے۔ صبح سویرے ادھر قدسیہ پارک چلا آتا ہوں۔ اور بھگوان کو یاد کرتا ہوں۔"

"میں بھی اپنے اصولوں کا بڑا پکا ہوں بھائی صاحب!" دوسرا بڈھا کہہ رہا تھا۔ "دیوے میں سٹیشن ماسٹر تھا مگر آج تک حرام کا پیسہ نہیں لیا۔ جب لیا کسی کی خدمت کر کے لیا۔ میں اس آدمی کو بڑا بے ایمان سمجھتا ہوں جو کسی کا پیسہ لے کر بھی کام نہیں کرتا۔ اس لئے جہاں رہا سب بیوپاری مجھ سے بڑے خوش رہے اور گورنمنٹ بھی مجھ سے بہت خوش رہی کیونکہ میرا کیریکٹر آج تک بے داغ رہا ہے۔ بھگوان کی قسم لے لو جو آج تک اپنی بیوی کے سوائے کسی دوسری عورت کو بُری نظر سے دیکھا ہو۔ شادیاں تو میں نے تین کیں مگر جب پہلی بیوی مر گئی تو دوسری کی۔ دوسری مر گئی تو تیسری کی۔ مگر قسم لے لو جو آج تک اپنی بیوی کے سوائے کسی دوسری کو بُری نظر سے دیکھا ہو۔ جب سے تیسری بیوی مری ہے گرہست کو بالکل تج دیا ہے اور پرمیشور سے لو لگالی ہے۔"

کل میں کس قدر اُداس تھا اور آج کتنا خوش تھا۔ آج صبح صبح خدا کے پانچوں نیک بندے ایک ہی جگہ یں اسی قدسیہ باغ میں مجھے مل گئے۔ ایک ہی گھنٹہ میں۔ جیسے بھگوان نے انہیں میرے ہی لئے یکجا کر دیا تھا۔

میں نے ان پانچوں نیک بندوں کو چبوترے کے نیچے گھاس پر بیٹھنے کو کہا اور خود چبوترے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنے بانس کے ڈنڈے کو کھڑا کیا اس کے نوکیلے سرے کی چری ہوئی پچی میں کل رات کی باسی روٹی اٹکائی اور بانس کے ڈنڈے کو ایک جھنڈے کی طرح اُونچا کرتے ہوئے بولا۔

"سجنو! تم بھگوان کے درشن کرنا چاہتے ہو۔ میں تم سے کہتا ہوں یہی روٹی پرم پرمیشور ہے۔ یہی اَن بھگوان ہے۔ روٹی کھاؤ اور اَن پیدا کرو، اور اَن پیدا کرنے کے لئے محنت کرو، کام کرو، کام کرو، اور کام مانگو اور جو نہ دے اس سے کہدو کہ جو راج سب کو کام نہیں دے سکتا وہ سب پر حکومت بھی نہیں کر سکتا۔ میں کہتا ہوں.....!"

مگر آگے میری بات کسی نے نہیں سنی۔ وہ لوگ بڑے زور سے ہنسنے لگے، مگر جب میں اُن کی ہنسی کی پروا کئے بغیر بولتا ہی چلا گیا تو وہ لوگ خفا ہونے لگے۔ خفا ہو کر چبوترے پر چڑھنے لگے۔ چند لمحوں میں ان پانچوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے ہاتھ سے بانس کا ڈنڈا چھین لیا اور اُسی بانس سے مجھے پیٹ پیٹ کر چبوترے پر بچھا دیا۔

قدسیہ پارک میں سناٹا تھا۔ پرانا یام کرنے والا پھر جھاڑی کے پیچھے پرانا یام کرنے چلا گیا تھا۔ چیونٹیوں کو آٹا ڈالنے والا پھر چیونٹیوں کو آٹا ڈالنے میں مشغول ہو گیا تھا۔ دونوں بڈھے ادویت فلسفے کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے تھے اور وہ نوجوان چاقو لے کر پھر یام کے تنوں سے مسلمانوں کے نام کاٹنے میں لگ گیا تھا۔ میں چبوترے پر زخمی حالت میں پڑا تھا۔ اور دُنیا واپس اپنے ڈھرے پر چلی گئی تھی۔

جمنا جی سے اشنان کر کے واپس آنے والوں کی قطار قدسیہ پارک میں داخل ہو رہی تھی۔ آگے آگے تین چار بڈھی عورتیں، گیلی میلی دھوتیاں ٹخنوں سے کچھ اوپر اور گھٹنوں سے نیچے تک اُٹھائے ہوئے، سر جھکائے، جاپ کرتی ہوئی چل رہی تھیں۔ میرے قریب چبوترے پر بیٹھا ہوا وہ نوجوان جس کے دل میں کوئی خواہش نہ تھی، ابھی

تک آنکھیں بند کئے گنگنائے جا رہا تھا۔ بھج من رام ہرے، بھج من رام ہرے......
یکایک اُس نوجوان نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بڈھی عورتوں کو دیکھ کر اُس نے پھر فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں اور کراہت آمیز لہجہ میں بڑبڑانے لگا۔ "ہائے کیسی سوکھی سوکھی ٹانگیں ہیں — بھج من رام ہرے کیسی سوکھی ٹانگیں ہیں۔ بھج من رام ہرے......"

پہلا بل

اُوشا نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اور مُڑ کر اپنے بھائی سے کہنے لگی: "رات کو میری بات سیٹھ جی سے ہو گئی تھی۔ اِس وقت پھر پکّی کر لی ہے۔ تم کو کل سے اُن کے آفس میں کام کرنا ہوگا۔ ساڑھے سات سو روپے سے شروع کرو گے۔ اور کہیں بھی پہنچ سکتے ہو۔ سیٹھ جی کی ایلومنیم فیکٹری کا مینیجر بارہ ہزار روپے ہفتہ لیتا ہے۔ تم بھی وہاں تک پہنچ سکتے ہو۔!"

کیلاش اُس وقت کھانے کی میز پہ کانچ کے ایک سنہرے بوٗل میں چکوترے کی گلابی پھانکیں کھول کر، اُن میں سے ذیرہ نکال کر اور اُسے شہد میں ملا کر کھا رہا تھا۔ اُس کے سامنے ایک قیمتی چینی صراحی میں نرگس کے پھوٗل سجے ہوئے تھے۔ پھولوں سے پرے زرد رنگ کے ریشمی پردے کھڑکی پر سرسرا رہے تھے۔ کھڑکی کے قریب اوشا کھڑی تھی۔ اس کے سنہرے کٹے ہوئے بال اُس کے نازک

شانوں کی چمپئی رنگت کی بے داغ جلد پر جھول رہے تھے۔ اڑتیس برس کی عمر میں بھی وہ بے حد حسین معلوم ہوتی تھی۔ کیلاش کو اپنی بہن کے حسن پر بے حد غرور تھا۔ چالیس کے لگ بھگ تو عورت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر جانے کیسے کیسے جتن سے اُوشا نے اپنے جسم کی شادابی اور خوبصورتی کو ابھی تک برقرار رکھا تھا۔ اُودے رنگ کی شفاف شنان کا پلّو تھامے ہوئے۔ وہ اس وقت کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کیلاش اس کے قریب جا کر کھڑا ہُوا۔ ایک حسین عورت کی نگاہ سے بمبئی کو دیکھنا کس قدر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اُودے رنگ کی ٹائیلوں والی چھتیں دور سمندر کے کنارے تک چلی گئی تھیں۔ سمندر کے کنارے کالے کالے تنوں والے ناریل دراز قد حبشیوں کی طرح ناریل کے مورپنکھ ہات میں تھامے کھڑے تھے۔ اور ان کے سبز پتے سمندر اور آسمان کے نیل گوں پس منظر میں جھالروں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔

کیلاش نے مسرت اور اطمینان کا ایک لمبا سانس لے کر پوچھا "مگر مجھے کام کیا کرنا ہوگا؟"

اُوشا نے کیلاش کی طرف مڑے بغیر سمندر کے پانیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا — "سمندر پار سے بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ ہمارے دیس میں بزنس کرنے کے لئے۔ تمہارا کام ہوگا۔ ان سے تعلق پیدا کرنا۔ ان کی دیکھ بھال اور خاطر کرنا۔ انہیں خوش رکھنا — یہ کام کرنے والو، کو آج کے زمانے میں CONTACT MAN کہتے ہیں۔ بہت اہم اور مشکل کام ہے۔"

"سمجھ گیا —" کیلاش لاپروائی سے بولا۔

"نہیں تم ابھی نہیں سمجھے ہو۔" اُوشا اب اُس کی طرف مُڑ کر بولی۔ "تم ابھی بائیس برس کے نوجوان ہو۔ تم نے اپنی بہن کی طرح زندگی نہیں دیکھی ہے۔ اور میں چاہتی بھی نہیں کہ تم دیکھو۔ میں نے تمہیں اب تک زندگی کی ہر غلاظت سے بچایا ہے جیسے کوئی ماں خود کمر تک کیچڑ میں دھنس کر اپنے بچّے کو اوپر بازوؤں میں اُٹھائے رکھتی ہے۔ اُسی طرح میں نے تمہیں غریبی اور اُس کی ہر آلائش سے اب تک بچائے رکھا ہے۔ میں چاہتی ہوں، کہ تم اب جلد سے جلد زندگی کے راستے پر آگے بڑھ جاؤ۔ اور ایک دن اپنے سیٹھ جی کی طرح لکھ پتی بن جاؤ۔" اُوشا کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی۔

"میں بھی لکھ پتی بننا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ بغیر پیسے کے، اور وہ بھی بہت سے پیسے کے بغیر زندگی عذاب ہو جاتی ہے۔" کیلاش نے کہا۔

"تم نے تو محض سُنا ہوگا۔ میں نے اس عذاب کو چکھا بھی ہے۔" اُوشا کھڑکی کے قریب ایک آرام کُرسی پر دراز ہوگئی۔ پیلے رنگ کے ٹیرلین گدّوں کے پس منظر میں اُس کے رُخساروں کے گلاب اور بھی نِکھر گئے۔

"بس میں چاہتی ہوں کہ تم جلد سے جلد لکھ پتی بن جاؤ۔ سیٹھ جی نے وعدہ کیا ہے۔ کہ اگر تم ان کے کہے پر چلتے رہے تو پانچ سال کے عرصے ہی میں وہ تمہیں لکھ پتی بنا دیں گے۔ ذرا سوچو تو جب تم ستائیس برس کے ہو گے۔ تو لکھ پتی بن جاؤ گے۔"

"میں سیٹھ جی کے کہنے پر حرف بحرف عمل کروں گا۔" کیلاش نے بڑی مضبوطی سے کہا۔ اور یہ کہتے وقت کیلاش کا نیچے کا جبڑا تن گیا۔ اور گردن اکڑ گئی۔ اور

وہ خاصا مضحکہ خیز دکھائی دینے لگا۔ اور اُوشا کو اس کے چہرے کی حماقت اور معصومیت پر ہنسی آگئی۔

"ابھی تم کتنے بھولے اور معصوم ہو کیلاش!" اوشا نے بڑے پیار سے اپنے بھائی سے کہا — "جاؤ واپس میز پر اور اپنا چکوترہ ختم کرو۔!"

کیلاش واپس چلا گیا۔ اور پھر اس نے پنج گمنی سے آئے ہوئے اصلی شہد کا ایک چمچہ بھرا اور اُسے چکوترے کے زیرے پر ڈالا۔ اُوشا رُخ پھیر کر باہر دیکھنے لگی۔ فضا میں شہد کی مکھیوں کی سی گونج تھی اور ہوا کی مہکتی ہوئی اُنگلیوں میں اِک عجیب ریشمی لطافت تھی۔ اُوشا کو نیند سی آنے لگی۔ یہ سارا منظر کس قدر خوب صورت ہے۔ یہ کمرہ کس قدر آرام دہ ہے۔ یہ نائی لان کی چپل کس قدر نرم ہے اور ان نرم چپلوں کے نیچے ایرانی غالیچے کے رنگ کس قدر پُر سکون ہیں۔؟ اس خوب صورتی پر ہر مہینے دو ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ کب تک خرچ ہوتے رہیں گے؟

یکایک اُوشا چونک گئی۔ سانپ کی طرح وہ سوال اُس کے سامنے لہرا رہا تھا۔ وہ بالکل مبہوت اور خائف ہو کر اس سوال کی طرف دیکھنے لگی۔ کب تک؟ کب تک؟ سیٹھ جی اُس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بہت محبت کرتے ہیں۔ مگر کب تک؟ کب تک؟ صرف اُس وقت تک، جب تک اُس کے جسم کی شادابی اور حُسن کا رس اور مہک باقی ہے۔ صرف اس وقت تک وہ اُس کے حُسن کو چکوترے کی طرح شہد میں ملا کر کھاتے رہیں گے۔ ایک ٹانک کی طرح اور جب وہ رس ختم ہو جائے گا۔ تو کوئی دُوسرا ٹانک ڈھونڈیں گے۔

نہیں۔ نہیں۔ سیٹھ جی ایسے نہیں ہیں۔ اب ایسے نہیں رہے۔ کم سے کم دو سال سے تو وہ مجھ سے ایسا سلوک کر رہے ہیں، جیسا اپنی بیوی سے۔ بالکل اپنی بیوی کی طرح۔ بار بار کہہ چکے ہیں"۔ اب آرام سے رہو۔ کھاؤ۔ پیو۔ موج کرو۔ اور پچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔ اب تو میں تم کو بھی ایسے ہی رکھتا ہوں۔ جیسے اپنی بیوی کو رکھتا ہوں۔ وہی خرچ۔ وہی مان۔ وہی عزت۔ بولو کوئی کسر ہے ؟"

"کسر تو نہیں تھی ـــــ مگر ـــــ ؟"

"مگر کیا ؟" اُوشا نے سوال کے لہراتے ہوئے بہن پر گہری نظر ڈال کر کہا۔ اری اب وہ دن تو گذر گئے۔ جوانی کے اور جوانی کے سُونے پن کے۔ جب دِل اپنے مقابل میں اپنا ہی کوئی ہم عمر مانگتا ہے۔ وہ اُنگلیاں جنہیں چُومنے سے بجلی دوڑے۔ وہ نگاہ جسے دیکھنے سے بدن ٹوٹنے لگے۔ وہ سانس جسے اپنے قریب محسوس کرتے ہی جی آرتی اُتارنے کو چاہے۔ وہ صُورت جس کے لئے عورتیں ماتھے پر سِندُور سجاتی ہیں سینے میں کسی "بچے" کا تصوّر لئے گھومتی ہیں۔ ہجر کی آگ ہو یا چتا کی آگ وہ خاموشی سے سر جھکا کے جل جاتی ہیں۔ اری! جب وہی شرلا۔ اور جب وہ زمانہ ہی بیت گیا۔ تو اُس کی شکایت کرنے سے کیا حاصل۔ اب تو یہی سوچ لے۔ کہ یہی کستُوری چند تیرے سب کچھ ہیں۔ وہی بھگوان۔ وہی دیوتا۔ وہی اپنے پتی..... !

سوچتے سوچتے اُوشا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سمندر میں ایک کشتی کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آج سے بہت سال پہلے۔ اِس طرح سیٹھ کستُوری چند ایک بجرے میں سوار ہو کر اُس کے گاؤں میں آئے تھے۔ اور

اُنہوں نے اُس کے ماں باپ سے اُسے خرید لیا تھا۔ وہ کال کا زمانہ تھا۔ اور اُس وقت اُس کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی اور سیٹھ کستوری چند کا قاعدہ تھا کہ وہ ہمیشہ لڑکیوں کو کمسنی میں خریدتے تھے۔ ایک تو سستی رہتی ہیں اور پھر مرد اُنہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال بھی سکتا ہے۔ سُنا ہے مجھ سے پہلے انہوں نے تین لڑکیاں اسی طرح خریدی تھیں......!

ارے کِدھر ہے تو میرے گنگا کے گاؤں۔ وہ بِسنا چرواہا جو گئیاں چراتا تھا۔ اور املی کے جھاڑ تلے میری چوٹی کھینچ کے کہتا تھا "تیرا میرا لگن ہوگا باوری! بول کب؟ بول کب؟" اور وہ پنڈت ہر پرساد اوجھا۔ شوالے کے پجاری جو ہمیشہ میرے سر پہ ہاتھ پھیر کے مجھے جوہی کے پھول دیتے تھے۔ اور میرے سہاگ وتی ہونے کی دعائیں کرتے تھے۔ اُس دعا کے دو دِن بعد ہی تو میرے ماں باپ نے مجھے بیچ دیا تھا۔ ارے بِسنے! تیری باوری باندھ دی گئی۔ رُوپیے کے سنگ۔ ارے رُوپیہ ہی تو وہ چرواہا ہے۔ جو گاؤں کی بھولی بھولی گیئوں کو ہانک کر شہر کے بُوچڑ خانے میں لے جاتا ہے۔ کیوں مجھے اس وقت اپنی ماں سے زیادہ اپنے گھر کا آنگن یاد آتا ہے۔ اور وہ کانسی کی کٹوری۔ جس میں ـــ دُودھ پیا کرتی تھی۔ اور اپنے باپ سے زیادہ مجھے اپنے آنگن کی تلسی یاد آتی ہے جس نے مجھے آج تک کہیں نہیں بیچا اور اس فلیٹ میں مہکنے والے فرانسیسی گلاب کے بجائے شوالے کا وہ بیلا جو پیسے کے بغیر مہکتا ہے...... اب تو میرے پاس سب کچھ ہے۔ اپنا فلیٹ۔ اپنی گاڑی۔ بینک میں رُوپیہ ـــ پھر مجھے ـــ ایسی باتیں کیوں یاد آتی ہیں۔ جن کی کوئی قیمت نہیں ہے؟......

اُوشا نے چپکے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے — پگلی ہو رہی ہوں ہیں۔ جو ایسی باتوں پر دھیان دیتی ہوں۔ ورنہ روپے کے بغیر کیا ممکن ہے ؟ ایک سیر دھان بھی روپے کے بغیر نہیں مل سکتا۔ میرے ماں باپ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لئے تو انہوں نے مجھے بیچ دیا۔ پھر میں بھی ہولے ہولے اگلے پانچ سات برسوں میں یہی بات جان گئی۔ تو میں اپنے ماں باپ کو دوش کیوں دوں ؟ کیا میں نے اپنے حسن کو ایک ہنر کی طرح نہیں بیچا ؟ جس طرح ایک وکیل اپنی وکالت کو اور ایک ڈاکٹر اپنی ڈاکٹری کی لیاقت کو اور ایک بوجھ ڈھونے والا اپنے جسم کی طاقت کو بیچتا ہے۔ ر یہ تو ایک بہت بڑی زندہ حقیقت ہے نا ! سیٹھ کستوری چند نے مجھے دھیرے دھیرے سب بتا دیا تھا کہ روپے کے ذریعے ہی سب کچھ بیچا جاتا ہے۔ اور سب کچھ خریدا جاتا ہے۔ چاہے وہ دھان ہو۔ چاہے عورت ہو چاہے ہنر ہو۔ اسی لئے تو میں نے اپنے جسم کے لوچ کو، اپنی رنگت کی تازگی کو، اپنے حسن کی مہک کو سینت سینت کے رکھا تھا۔ تاکہ گاؤں میں میرے ماں باپ کا پکا گھر بن جائے۔ اور میرے بھائی بہن کبھی بھوکے نہ رہیں۔ اور میرا سب سے پیارا بھائی کیلاش پڑھ لکھ کے کام پر لگ جائے اور آج جب وہ دن آگیا ہے۔ تو جانے کیوں آج میرا من بار بار گھبراتا ہے۔ اور مجھے اپنے آنگن کی مٹی اور گنگا کی ریت یاد آتی ہے۔

"تم رو رہی ہو بہنی ؟" کیلاش نے قریب آ کے اپنی بہن کے شانے پر بڑے پیار سے ہات رکھ کے کہا۔

"ہاں کیلاش !" اُوشا نے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی

اُسی طرح روتے روتے بولی۔ "ایک دِن میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی۔ کہ جس دن میرا بھائی کام پر لگ جائے گا۔ میں اُس دن اپنے جیون کو سپھل سمجھ لُوں گی۔ تیرتھ یاترا جانے کی تیاری کروں گی۔ میں سمجھتی ہُوں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے ــــ"

(۲)

آج کیلاش کا آفس میں پہلا دن تھا۔ وہ اپنی کیبن میں بیٹھا ہوا بڑی مُستعدی سے کام کر رہا تھا۔ کیبن صاف ستھرا اور ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ باہر دروازے پر ایک چپراسی تھا۔ اندر ایک گھنٹی تھی۔ ایک ٹیلی فون تھا۔ اور ایک نوجوان آدمی جو جلد سے جلد لکھ پتی بننا چاہتا تھا۔ اُس کے ارادے بُلند تھے۔ اُمیدیں وسیع اور مستقبل روشن اور ایک طرح سے وہ اس آفس کو اور اِس بلڈنگ کو اپنا ہی خیال کرتا تھا۔ کیوں کہ سیٹھ جی اُس کے اپنے ہی تھے۔ ایک طرح سے، یہ بات سب جانتے ہیں۔ وہ خود بھی جانتا ہے۔ ورنہ محض ایک معمولی گریجوئیٹ کو ساڑھے سات سو کی ملازمت اتنی آسانی سے کہاں مل سکتی ہے؟ وہ سب جانتا تھا اسی لئے مکمّل طور پر سیٹھ جی پر بھی تکیہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ خود اپنی کاوش سے آگے بڑھے گا۔ ہوشیاری اور سمجھ داری سے ہر کام کرے گا۔ خود ہر وقت اس آفس میں چوکس رہ کر دیکھے گا۔ کہ سیٹھ جی روپیہ کیسے بناتے ہیں۔ جنرل منیجر ڈی پی سہائے اس قدر امیر کیسے بن گیا ہے؟ وہ بڑی ہوشیاری مگر چالاکی سے ہر شخص پر نظر رکھے گا۔ اور زندگی کے وہ تمام گُر سیکھ لے گا۔ جو انسان کو امارت

اور فراغت کی منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ کیوں کہ روبی بہت ہی فضول، اور بہت ہی خوبصورت لڑکی ہے۔ ساڑھے سات سو میں تو مشکل سے اُس کے دو ڈریس بنیں گے۔ ساڑھے سو کی ملازمت سے وہ رُوبی کا دل نہیں جیت سکتا۔ اُس کے لئے اُسے لکھ پتی بننا ہی پڑے گا۔ رُوبی کے لئے اور اپنے لئے اور اُن تمام چیزوں کے حصول کی خاطر جو زندگی کو آرام دہ، پُرسکون اور پیاری بناتی ہیں۔ اُسے لکھ پتی بننا ہی پڑے گا۔ سیٹھ جی کے قریب رہ کر خاموشی سے اُن کی چالوں کو سمجھ کر وہ نسخہ ضرور حاصل کر لے گا۔ جس سے سیٹھ جی اتنے بڑے لکھ پتی بنے ہیں۔ اس نسخے کو معلوم کرنا مشکل نہ ہونا چاہیئے۔ آخر وہ بھی عقل رکھتا ہے۔ اور اتنا معصوم اور بھولا نہیں ہے۔ جتنا اس کی بہن اُسے سمجھتی ہے۔

اتنے میں جنرل منیجر وی پی سہائے کا ٹیلی فون آگیا۔ "رو لیکس کمپنی کے نمائندے مسٹر براؤن دو بجے کے ہوائی جہاز سے لندن سے آرہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے نا؟" سہائے صاحب ٹیلی فون پہ پوچھ رہے تھے۔

"جی معلوم ہے۔" کیلاش نے جواب دیا۔

"تمہیں اُنہیں لینے کے لئے ہوائی اڈے پر جانا ہوگا۔"

"وہ بھی معلوم ہے۔"

"اُن کے رہنے، کھانے پینے، سیر تفریح کا سب پروگرام تمہارے ذمے ہے۔ جانتے ہو؟"

"جی!"

"ان کی تفریح کا پروگرام بنا لیا؟"

"جی۔ بنا لیا۔"

"اور خرچے کا تخمینہ؟"

"جی۔ وہ بنا رہا ہوں۔"

"جلدی پیش کرو۔"

"ابھی دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔"

وی پی سہاتے نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ کیلاش نے ایک سفید کاغذ پر پنسل سے جو تخمینہ تیار کیا تھا۔ اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر تخمینے کی ہر شق پر غور کرنے لگا۔

کال گرل : ۵۰۰

(ایک سو روپے میں عمدہ کال گرل آ جاتی ہے۔ مگر مسٹر براؤن کو بہت ہی بڑھیا اور بہت ہی ہندوستانی لڑکی چاہیئے۔ مسٹر براؤن کے اسسٹنٹ نے جو ایک دن پہلے ہوائی جہاز سے آ چکا تھا۔ کیلاش کو بتایا تھا۔ مگر مسٹر براؤن ایک غیر ملکی اور اجنبی ہیں۔ ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ کہ وہ ایک سو اور پانسو والی ہندوستانی لڑکی میں تمیز کر سکیں۔ لہٰذا چار سو روپیہ تو کیلاش سیدھا اس مد میں سے کھا لے گا۔ خیر تین سو تو کہیں نہیں گئے۔ دو سو والی کال گرل لے آئیں گے۔)

وہسکی: بلیک ڈاگ : ۴۰۰

(اسسٹنٹ کہتا ہے۔ کہ مسٹر براؤن صرف بلیک ڈاگ پیتے ہیں۔ جو بمبئی میں صرف بلیک سے مل سکتی ہے۔ روبی کا بھائی سمگلنگ کا دھندا کرتا

ہے۔ اس نے دو سو روپے میں دو بوتلیں دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے چار سو روپے لکھ لئے ہیں۔ دو سو یہاں سے کھرے ہو جائیں گے،

ہوٹل : ۳۰۰

(اس میں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ ہوٹل کا بل ہر وقت چیک کیا جا سکتا ہے۔ سوری کیلاش!)

ٹیکسی : ۱۰۰

(دو دن کی ٹیکسی کے لئے سو روپے زیادہ نہیں ہیں۔ میں اپنے دوست یوسف اسمٰعیل کی اِمپالہ مانگ لوں گا۔ دو دن کے لئے۔ اپنا یار ہے۔ اس لئے پیٹرول بھی خود بھروا کے دے گا۔ سو روپے یہاں سے بچا لوں گا۔ ۔۔۔صفا)

متفرق ۴۰

(سگریٹ ماچس۔ ٹپ اور دیگر متفرقات کے لئے چالیس لگا لو۔ اب چالیس روپے کی گھٹیا رقم میں سے کچھ چرانا زیب نہیں دیتا۔ اس میں سے جو رقم بچے گی۔ وہ میں اپنے اسسٹنٹ کو دے دوں گا۔ ٹھیک)

کیلاش نے بڑی احتیاط سے تخمینے کی ہر مد پر غور کیا۔ کُل تخمینہ تیرہ سو چالیس روپے کا بیٹھتا ہے۔ زیادہ بھی نہیں ہے۔ بالکل سٹینڈرڈ ریٹ کے مطابق ہے۔ پھر بھی وہ اس ایک تخمینے میں سے چھ سو کی رقم ضرور بچا لے گا۔ چھ سو دو دن کی کمائی؟ بُری نہیں۔ دو دن میں چھ سو۔ تو ایک ماہ کتنے؟ ایک ماہ میں! اگر پانچ چھ ایسے تخمینے مل جائیں۔ تو پانچ سال میں وہ کسی سیٹھ

کی مدد کے بغیر ہی لکھ پتی ہو سکتا ہے۔ کیلاش یہ سوچ کر مسکرایا۔ پھر اس نے سُرخ پنسل سے تخمینے کے حاشیئے پر کانفیڈنشل لکھا، اور سہائے صاحب کے کیبن میں چلا گیا ــــ

سہائے صاحب نے تخمینہ دیکھ کر اُس پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ کاغذ واپس دیتے ہوئے بولے۔

"اسے سیٹھ جی سے پاس کرا لیجئے!"

"سیٹھ جی سے کیوں؟" کیلاش نے حیرت سے پوچھا ــــ "دس ہزار تک کے تخمینے تو آپ اپنے اختیارات سے پاس کر دیتے ہیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے" سہائے نے مسکرا کر کہا۔ "مگر کیلاش جی قصّہ یہ ہے۔ کہ جب کوئی نیا ایگزیکٹو آتا ہے۔ تو سیٹھ جی چھ ماہ تک اُس کے سارے تخمینے خود پاس کرتے ہیں"

"اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

"اس سے اُس نئے نئے آنے والے ایگزیکٹو کی تربیت ہو جاتی ہے اور وہ دوبارہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ خود میری تربیت بھی اسی طرح سیٹھ جی نے کی تھی۔۔۔۔۔ آپ یہ تخمینہ لے کر سیدھے سیٹھ جی کے پاس جائیے۔ انہوں نے آپ کو بلایا بھی ہے"

کیلاش کیبن کا دروازہ کھول کر باہر کوریڈور میں آیا۔ آدھے فرلانگ لمبے بجلی کی ٹیوبوں سے منوّر ــــ روشن کوریڈور سے گزرتا ہوا سیٹھ جی کے کیبن میں پہنچا۔ سیٹھ جی نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور اپنے سامنے کرسی پر

بٹھالیا۔ اور اُس کا تخمینہ پڑھنے لگے۔ اور کیلاش ان کا چہرہ پڑھنے لگا۔ یہ چہرہ تو ایک بہت ہی مہربان اور میٹھے مزاج کے آدمی کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ آواز ایسی شیریں اور رس دار کہ معلوم ہوتا ہے۔ حلق میں گنڈیری رکھی ہوئی ہے۔ گزشتہ دس برس میں ہزاروں بار کیلاش نے اس چہرے کو دیکھا تھا۔ کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسا میٹھا بے ضرر اور تقریباً گاؤدی نظر آنے والا انسان کروڑپتی کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اب تک اس نے سیٹھ جی کو صرف اپنے گھر پہ دیکھا تھا۔ آفس میں بات کرنے کا پہلا موقع تھا۔

سیٹھ کستوری چند کستور بانے کیلاش کے تخمینے پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔

کال گرل	۵۰۰
وہسکی بلیک ڈاگ	۴۰۰
ہوٹل	۳۰۰
ٹیکسی	۱۰۰
متفرق	۴۰
کُل	۱۳۴۰ روپے

سیٹھ جی مسکرا کر بولے۔ "کُل ۱۳۴۰ روپے؟ —— جیادہ تو نہیں معلوم ہوتے۔ ٹھیک ہی لگتا ہے۔ مجھے تو یہ بجٹ! کیوں کیلاش جی؟"

"جی ہاں۔ بہت ہی سوچ کے بنایا ہے۔" کیلاش نے خوش ہو کے کہا۔

وہ تو لگتا ہی ہے۔ وہ تو لگتا ہی ہے۔" سیٹھ جی مسکرا کر بولے۔" اور یہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر یہ کال گرل؟ پانسو میں آتی ہے۔ کیا؟ کچھ جیادہ نہیں ہے کیا؟"

"براؤن صاحب کو بہت ہی بڑھیا اور بہت ہی ہندوستانی کال گرل چاہیئے۔ یہ ان کی خاص فرمائش ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ خاص فرمائش ہے۔ تو جرور پوری کرنی چاہیئے۔"

سیٹھ جی نے بلو پنسل سے کال گرل کی کو ٹِک مارک کر دیا۔ گویا پاس کر دیا۔ کیلاش نے اطمینان کا سانس لیا۔ چلئے چار سو تو کھرے ہوئے۔

سیٹھ جی نے اب دوسری مد کو پکڑا۔" وہسکی! چار سو روپیہ؟" ابرو اونچے کر کے انہوں نے کیلاش کی طرف دیکھا تو کیلاش جلدی سے بولا۔" براؤن صاحب کے اسسٹنٹ نے بتایا ہے۔ کہ وہ صرف بلیک ڈاگ پیتے ہیں۔ میں نے بہت سے سمگلروں سے معلوم کیا ہے۔ وہ دو سو سے کم نہ لیں گے ایک بوتل کے لئے اب جیسا آپ فرمائیں؟ آپ کہیں تو کسی سستی وہسکی کا بندوبست کروں؟"

سیٹھ جی جلدی سے سر ہلا کے بولے۔" نہیں۔ نہیں۔ اب براؤن صاحب کالا کُتا پیتے ہیں۔ تو اُن کو کالا کُتا ملے گا۔" سیٹھ جی نے اس کو بھی ٹک کر کے پاس کر دیا۔ اور آگے بڑھے۔

"ہوٹل تین سو روپے! مگر کس ہوٹل میں ٹھہرا رہے ہیں آپ اُن کو؟"

"سرتاج میں۔"

سیٹھ جی مسکراتے ہوئے بولے "شاید آپ کو معلوم نہیں ہے میرین ڈرائیو پر اپنا ایک شاندار گیسٹ ہاؤس ہے۔ باہر سے آنے والے ایسے ہی یورپین مہمانوں کے لئے، براؤن صاحب کو وہاں ٹھہرا دو۔"

اتنا کہہ کر سیٹھ جی نے تین سو کی رقم کو تخمینے میں سے کاٹ دیا۔ مگر کیلاش کو رتّی برابر ملال نہ ہوا۔ کیوں کہ ہوٹل کے بِل میں سے کچھ کمائی ہونے کی اُمید نہ تھی۔

"اور یہ سو روپے ٹیکسی کے؟ جیادہ تو نہیں ہیں۔ مگر ٹیکسی پر خرچ کیوں کرتے ہو۔ میری گاڑی لے جاؤ ناں۔" سیٹھ جی نے مشورہ دیا۔

"آپ کی دونوں گاڑیاں مرمّت کے لئے گئی ہیں۔"

"تو سہائے صاحب کی گاڑی لے جاؤ۔"

"وہ پُونا گئی ہے۔ اس لئے میں نے ایک پرائیویٹ امپالہ کا انتظام کیا ہے۔ صرف سو روپے میں۔ دو دن کے لئے مع پٹرول کے۔"

"صرف سو روپئے میں امپالہ؟ دو دن کے لئے؟ اور وہ بھی پٹرول کے ساتھ؟ ناممکن ہے۔" سیٹھ جی نے بڑے فخر اور غرور سے کیلاش کی طرف دیکھا۔ کیلاش کا مُنہ۔ سیٹھ جی کی مسکراہٹ دیکھ کر مُسرّت سے پھُول گیا۔ ٹِک! سو روپئے جیب میں،

"چالیس روپئے متفرق۔ یہ تو بالکل مناسب ہیں۔" سیٹھ جی پھر بولے۔ ٹِک! کیلاش نے اطمینان کا سانس لیا۔ صرف ہوٹل کی مَد کٹی تھی۔ چلئے ٹھیک ہے۔ سیٹھ جی کاغذ پر دستخط کرنے لگے۔ یکایک انہیں کچھ خیال آیا۔ انہوں نے اُسی وقت ٹیلی فون اُٹھا کے کہیں ٹیلی فون کیا۔ ٹیلی فون پر گفت گو کچھ ایسے طریقے سے

ہوئی۔ کہ کیلاش کچھ سمجھ نہ سکا۔ چند منٹ کے بعد سیٹھ جی نے ٹیلی فون نیچے رکھ دیا۔ خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے "ایک سفارت خانے میں فون کیا ہے۔ اُدھر اپنا ایک پہچان والا ہے۔ وہاں سے دو بلیک ڈاگ کا بندوبست ہوگیا ہے۔" اتنا کہہ کر سیٹھ جی نے بلیک ڈاگ کے چار سو روپے کاٹ دیئے پھر پنسل کا موٹا سرا ہاتھ میں لے کر اپنے دانت بجانے لگے۔ اور کیلاش اُن کا گلا دبانے کی سوچنے لگا۔

سیٹھ جی نے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اکدم کھول دیں ایسی روشن مسکراہٹ اُن کے چہرے پر آئی۔ جیسے اُن کے اندر ہزار واٹ کا بلب روشن ہوگیا ہو۔ بڑے پیار سے کیلاش کی طرف دیکھ کے بولے——

"کیلاش بیٹا! تم رستوگی کو جانتے ہو نا۔ اپنے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔؟"

"جی ہاں!"

"اُس کی شادی حال میں ہی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں!"

"جہیز میں اُسے ایک نئی کیڈی لک ملی ہے۔"

"جی ہا—— ہاں!" کیلاش کا گلا رُکنے لگا۔

"میرا نام لے کر اُس سے دو دِن کے لئے وہ گاڑی لے لو۔" سیٹھ جی خوش ہوکر بولے۔ پھر بلو پنسل لے کر سیٹھ جی نے ٹیکسی کے ایک سو روپے بھی کاٹ دیئے——

اب کال گرل کے پانسو رہ گئے تھے۔ اور متفرق کے چالیس رُوپے۔

"یہ کال گرل پانسو؟ —— کال گرل پانسو! کیا زمانہ آگیا ہے۔ دھرم کا تو نام ہی اُڑ گیا ہے اِس دُنیا سے۔ رچے دیکھو۔ ذرا سے کام کے لئے کال گرل مانگتا ہے۔ کل جُگ آگیا ہے۔ اب تو —— گھور کل جُگ! —— کال گرل۔ کال گرل۔ کیا کال گرل پانسو سے کم میں نہیں آسکتی کیلاش جی؟"

"وہ بہت ہی بڑھیا۔ بہت ہی سُندر لڑکی مانگتے ہیں۔ سیٹھ جی!" کیلاش نے "بہت ہی سندر" پر بہت زور دیا۔

سیٹھ جی نے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں۔ سوچ سوچ کر بولے۔
"تو سندر تو اپنی اُوشا بھی کسی سے کم نہیں ہے۔! باہر جانے کی ضرورت کیا ہے ——؟"

اِتنا کہہ کر سیٹھ جی نے جلدی سے "کال گرل پانسو" کی مد پر بھی لکیر پھیر دی اور صرف چالیس رُوپے متفرق کی رقم منظور کر کے کاغذ کیلاش کے ہات میں واپس تھما دیا۔ اور پھر کسی دوسری فائل میں مصروف ہو گئے۔

[م جہ رل]